ماہنامہ

فروری 2026ء

طلوعِ اسلام

لاہور

اشاعت کا بیاسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

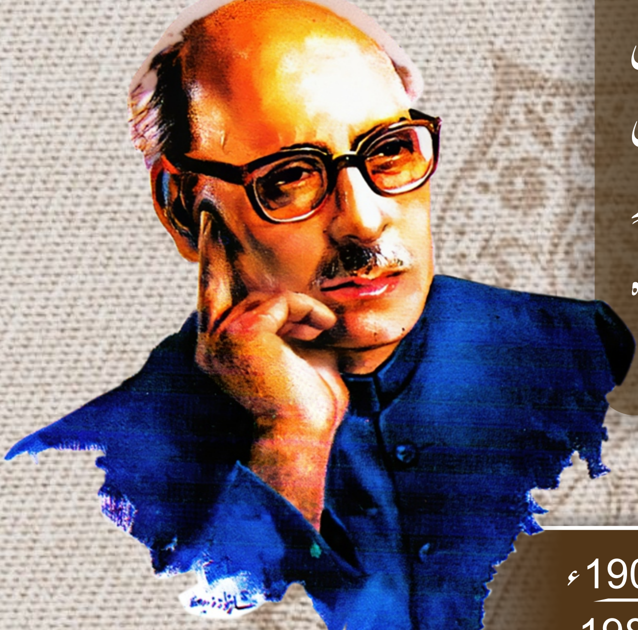

مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویزؒ، معراجِ انسانیت)

09 جولائی 1903ء

24 فروری 1985ء

پرویزؒ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مذہب اور دینِ اسلام کا تقابلی جائزہ

یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح کو مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلا تنقید اسے قبول کر لیا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے مذہب (Religion) اور سیاست (State) کی ثنویت کا تصور پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں مذہب کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا۔ اس لئے اسلام کو مذہب نہیں بلکہ قرآن کے دیئے ہوئے دین کے نام سے پکارنا چاہئے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (3:19)-

مذہب	دینِ اسلام
1- مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔	دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوعِ انسانی سے مخاطب اور اس کا رب، رب العالمین اور رسول رحمۃ للعالمین کا مقام رکھتے ہیں۔
6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
فروری 2026ء

جلد 79 | شمارہ نمبر 02

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: پارٹیاں	ادارہ	4
علامہ غلام احمد پرویزؒ (قرآن، فکر اور تاریخ کا زندہ حوالہ)	خورشید انور	5
فکرِ پرویز۔۔۔ایک مختصر ترین تاثر	جمیل احمد عدیل	8
شعلۂ نمناک	علامہ غلام احمد پرویزؒ	15
قرآن اور انسانی عقل	ڈاکٹر اعجاز رسول، یوکے	44
ڈاکٹر بلند اقبال کے جواب میں چند گزارشات	عمران شاہد، ٹورانٹو	50
خواتین کا صفحہ: عورت اور قرآن (قسط نمبر:3)	جمیلہ خاتون پالوی، بھارت	52
مرحلہ وار سلسلہ۔۔۔پوسٹ نمبر:2	انجینئر سلیم اقبال	54
بچوں کا صفحہ: نئے پڑوسی	ادارہ	56
روزہ کے احکام	ادارہ	59

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 100 روپے فی پرچہ
پاکستان: 1200 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1500 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
Cell: +92 318 2221851
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پارٹیاں

مملکتِ خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان میں چھوٹے اور بڑے ہزاروں ہوٹل اور ریستوران ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجے کے ہوٹل اور ریستوران بھی سینکڑوں کی تعداد سے کم نہ ہوں گے۔ آپ کسی شام، کسی ہوٹل میں چلے جائیے۔ رمضان کے مہینہ میں کسی نہ کسی کو افطار پارٹی دی جا رہی ہوگی۔ عام دنوں میں ظہرانہ، عصرانہ، عشائیہ، ہائی ٹی اور پتہ نہیں اس کے علاوہ اور کیا کیا۔ یہ پارٹیاں بالعموم Stablished لیڈروں یا بننے والے لیڈروں کے اعزاز میں متوقع مفاد کے حصول کے لئے تقریب کا کام دیتی ہیں۔ بعض لیڈر ایسے بھی ہیں جن کے اعزاز میں ہفتوں تک پارٹیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک ایک پارٹی میں پانچ پانچ سو مہمان۔ ہوٹل والے، پانچ سو روپے سے لے کر پندرہ سو روپے فی کس کے حساب سے وصول کرتے ہیں۔ اس کے بدل میں جو کچھ وہاں سے ملتا ہے اس میں پچاس فیصدی چمک دمک۔ چالیس فی صدی بیماری اور دس فیصدی غذا ہوتی ہے۔ یہ اس قوم کے مشغلے ہیں جس کے کروڑوں نفوس ایسے ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ ایک دن میں ہی آٹا چینی کے حصول میں قطار میں کھڑی 18 خواتین دم گھٹنے سے مر جاتی ہیں۔ جس کی آبادی کا بیشتر حصہ منجمد کر دینے والے جاڑوں اور جھلسا دینے والی گرمیوں میں سڑکوں پر سوتا ہے۔ جن کے لاکھوں گھرانے خستہ وخراب دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں جن کی ہزارہا بیٹیاں اور بہنیں ہاتھ پیلے ہونے کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی ہیں۔ جن کے یتیموں کا کوئی وارث نہیں، جن کی بیواؤں کا کوئی پرسان حال نہیں، جن کے بیماروں کو دوا میسر نہیں، جن کے مُردوں کو کفن تک نصیب نہیں، یہ جگمگ جگمگ کرنے والی پارٹیاں اسی قوم کے غم میں گھلنے والے لیڈروں کو دی جاتی ہیں۔ نہ پارٹیاں دینے والوں کو شرم آتی ہے۔ نہ انہیں قبول کرنے والوں کو حیا۔ یہ انسانی نظام کی وہ ناہمواریاں ہیں جنہیں قرآن فساد فی الارض کہہ کر پکارتا ہے اور جس کا فطری اور لازمی نتیجہ بربادی اور تباہی قرار دیتا ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

قسم ہے بغداد اور رومتہ الکبریٰ کے کھنڈرات کی! یہ کچھ قوموں اور سلطنتوں کے مٹنے کے زمانے میں ہوا کرتا ہے، ابھرنے کے وقت نہیں!

خورشید انور (چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

علامہ غلام احمد پرویزؒ

قرآن، فکر اور تاریخ کا زندہ حوالہ

قوموں کی تاریخ میں کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو اپنے عہد کی حدود سے بلند ہو کر آنے والے زمانوں کی فکری سمت متعین کرتی ہیں۔ وہ وقتی مقبولیت، وقتی شور اور وقتی پذیرائی کی محتاج نہیں ہوتیں۔ ان کا اصل حوالہ وقت نہیں بلکہ حق ہوتا ہے۔ مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ ایسی ہی نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ ایک فرد، ایک ادارہ، ایک تحریک اور ایک عہد۔

24 فروری اس مردِ حق کی برسی کا دن ہے، جس نے اپنی پوری زندگی قرآنِ حکیم کے فہم، اس کے پیغام کے ابلاغ اور اس کے انقلابی نظام کے قیام کے لیے وقف کر دی۔ مگر ہماری قومی بدقسمتی یہ ہے کہ نہ الیکٹرانک میڈیا پر ان کا ذکر ہوتا ہے، نہ اخبارات و رسائل میں ان پر سنجیدہ تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ اس خاموشی کی وجہ لاعلمی نہیں بلکہ خوف ہے، اس فکر کا خوف جو مذہبی اجارہ داری، مصنوعی تقدس اور موروثی پیشوائیت کی بنیادیں ہلا دیتی ہے۔

ابتدائی زندگی: روایت سے تحقیق تک:

علامہ غلام احمد پرویزؒ 9 جولائی 1903ء کو متحدہ ہندوستان کے شہر بٹالہ میں ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی دینی تعلیم اپنے دادا مولوی رحیم بخشؒ سے حاصل کی۔ یہ وہ دور تھا جب مذہب زیادہ تر روایت، تقلید اور رسوم کا مجموعہ بن چکا تھا۔ مگر پرویزؒ کی فطرت سوال کرنے والی تھی، مان لینے سے پہلے سمجھنے والی تھی۔

اعلیٰ تعلیم کے بعد انہوں نے حکومتِ ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت اختیار کی، مگر سرکاری ملازمت ان کے فکری سفر میں کبھی رکاوٹ نہ بن سکی۔ سر سید احمد خانؒ کی عقلی جرأت، علامہ اسلم جیراجپوریؒ کی قرآنی بصیرت، علامہ اقبالؒ کی فکری بلند پروازی اور سب سے بڑھ کر خود قرآنِ حکیم، یہ وہ سرچشمے تھے جن سے ان کی فکر نے جلا پائی۔

ختمِ نبوت: علم، دلیل اور قرآن:

برصغیر کی دینی تاریخ میں 1926ء کا بہاولپور مقدمہ محض ایک عدالتی کیس نہیں تھا بلکہ ایک فکری سنگِ میل تھا۔ سوال یہ تھا کہ نبوت کی حقیقت کیا ہے اور نبی کسے کہتے ہیں؟ اس مقدمے میں برصغیر کے نامور علما پیش ہوئے، مگر عدالت کو ایسی جامع تعریفِ نبوت درکار تھی جو براہِ راست قرآن سے ماخوذ ہو۔

یہاں علامہ غلام احمد پرویزؒ کی فکر فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ ان کی تحریر نے نبوت کو نہ فرقہ وارانہ جذبات کے آئینے میں

دیکھا، نہ روایتی فقہی سانچوں میں ڈھالا، بلکہ خالص قرآنی اصولوں پر واضح کیا۔ 7 فروری 1935ء کو سنایا جانے والا فیصلہ آج بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ جب علم، دلیل اور قرآن یکجا ہو جائیں تو تاریخ کا رخ بدل دیا جاتا ہے۔

بعد ازاں ان کی تصنیف ''ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت'' اس موضوع پر ایک مستقل فکری حوالہ بن گئی ایسی کتاب جس میں جذبات نہیں، استدلال ہے؛ نفرت نہیں، وضاحت ہے۔

فکری جرأت: روایت شکنی کا حوصلہ:

علامہ پرویزؒ کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی فکری بے باکی تھی۔ جب مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ترجمان القرآن میں مذہبی ہم آہنگی کو قرآن کا مطلوب قرار دیا گیا، تو علامہ پرویزؒ نے نہ شخصیت کو دیکھا، نہ شہرت کو، بلکہ صرف قرآن کو معیار بنایا۔

1933 میں ماہنامہ معارف میں شائع ہونے والا ان کا مضمون اس بات کی دلیل ہے کہ حق بات کہنے کے لیے عمامہ یا مسند نہیں، بلکہ یقین، علم اور اخلاقی جرات درکار ہوتی ہے۔

تحریکِ پاکستان: فکر سے ریاست تک:

1930 کا خطبۂ الہ آباد علامہ پرویزؒ کے لیے محض ایک تقریر نہیں بلکہ ایک فکری اعلان تھا۔ جب علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ مکمل دین ہے، اور اسے عملی شکل دینے کے لیے ایک آزاد ریاست ناگزیر ہے، تو علامہ پرویزؒ نے اس تصور کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے انہیں دینی محاذ کی ذمہ داری سونپی۔ مئی 1938ء میں طلوعِ اسلام کا اجرا ہوا، جو تحریکِ پاکستان کی فکری ریڑھ کی ہڈی بن گیا۔ قریب ایک دہائی تک علامہ پرویزؒ قائداعظمؒ کے دینی مشیر رہے اور یہ ثابت کرتے رہے کہ پاکستان کا قیام قرآن کا تقاضا ہے، محض سیاست کا نتیجہ نہیں۔

شبانہ محافل اور عوامی بیداری:

سرکاری ملازمت کے باعث علّامہ پرویزؒ مسلم لیگ کے کھلے سیاسی اسٹیج سے خطاب نہیں کر سکتے تھے، تاہم دہلی اور اس کے نواحی شہروں میں ایک منفرد حکمتِ عملی اختیار کی گئی۔ مسلم لیگ کے جلسوں کے فوراً بعد اُسی اسٹیج پر بزمِ اقبالؒ کے عنوان سے محافل منعقد ہوتیں، جہاں علّامہ پرویزؒ قرآن اور فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں تحریکِ پاکستان کے مقاصد عوام کے سامنے رکھتے۔

یہ محافل محض تقاریر نہیں بلکہ فکری تربیت کا ذریعہ تھیں، جنہوں نے عام مسلمانوں کو یہ سمجھنے میں مدد دی کہ پاکستان کیوں ضروری ہے۔

ریفرنڈم 1946 اور فیصلہ کن کردار:

1946 میں صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) میں پاکستان میں شمولیت یا عدمِ شمولیت کے سلسلے میں ہونے والا ریفرنڈم

تحریکِ پاکستان کا ایک نازک مرحلہ تھا۔ علّامہ پرویزؒ نے صوبائی صدر بخت جمال خان اور دیگر مسلم لیگی رہنماؤں کے ساتھ مل کر شدید مخالفتوں کے باوجود عوامی شعور بیدار کیا اور بالآخر صوبہ سرحد کے مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ کن ووٹ دیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد: تنہائی کا سفر

پاکستان بن گیا، مگر وہ پاکستان نہ بن سکا جس کا خواب دیکھا گیا تھا۔ وہی طبقے جو تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے، اب اسلام کے ٹھیکیدار بن گئے۔ علامہ پرویزؒ پر الزامات، فتوے اور بہتان لگائے گئے، مگر وہ ثابت قدم رہے۔

قرآن: زندگی کے ہر شعبے کا رہنما

علامہ پرویزؒ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کو صرف عبادات کی کتاب نہیں رہنے دیا، بلکہ اسے معاشرت، معیشت، سیاست، قانون اور اخلاق کا مکمل ضابطہ بنا کر پیش کیا۔

لغات القرآن، مفہوم القرآن، مطالب الفرقان، نظامِ ربوبیت، معراجِ انسانیت، اقبال اور قرآن، قرآنی فیصلے یہ سب اس فکری جدوجہد کی یادگار ہیں۔

طلوعِ اسلام: ایک زندہ تحریک

انہوں نے ادارہ طلوعِ اسلام اور تحریکِ طلوعِ اسلام قائم کی تاکہ قرآن ایک فرد کی فکر نہ رہے بلکہ اجتماعی شعور بنے۔ تعلیمی ادارے کا خواب بھی دیکھا، جو حالات کی نذر ہو گیا، مگر فکر زندہ رہی۔

اختتام نہیں، تسلسل

24 فروری 1985 کو یہ مردِ درویش دنیا سے رخصت ہوا، مگر اس کی فکر آج بھی سوال کرتی ہے، جھنجھوڑتی ہے، اور دعوت دیتی ہے:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

واقعی، قرآن کے بغیر اسلام محض رسم ہے، اور قرآن کے ساتھ اسلام انقلاب ہے۔

اللہ تعالیٰ علامہ غلام احمد پرویزؒ کو اپنی رحمتوں سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جمیل احمد عدیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکرِ پرویز۔۔۔ایک مختصر ترین تاثر

جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، یہ کوئی تیس بتیس سال پرانی بات ہے، یعنی یہی کوئی آٹھ دس برس کی عمر میں ہماری سماعت سے یہ فقرہ ٹکرایا تھا ''لوجی! مسلمانوں میں پرویزیوں کے نام سے ایک نیا فرقہ ایجاد ہو گیا ہے۔'' یہ الفاظ ہمارے ایک پیر پرست مہربان کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ یہ صاحب پاکپتن میں ہمارے میزبان تھے۔ یہ تھا ''فکرِ پرویز'' سے ہمارا پہلا تعارف۔ عہدِ طفولیت میں بھلا ہمیں اس ''فرقے'' سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی، تاہم تجسس کا پہلا بیج اسی دن بویا گیا۔ کئی سال گزر گئے، لیکن نہ جانے کیوں متذکرہ نیم طنزیہ تعارفی جملہ ہمیں بھولا نہیں، تا آنکہ ہمیں دسویں جماعت میں ایک بزرگ استاد کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ رحیم بھٹہ صاحب اس ہستی کا اسم گرامی ہے۔ جواب کافی معمر ہو چکے ہیں۔ ''جماعت احمدیہ'' کے برگزیدوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہمیں رحیم صاحب کے بے حد احترام کے باوجود ان کے مذہبی اعتقادات سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کے متعلق اور کیا کہیں بس غالب کا یہ شعر عرض کر سکتے ہیں ؎

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اس عاجز پر رحیم صاحب کے لاتعداد احسانات میں سے سرفہرست یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں ''فکرِ پرویز'' سے باقاعدہ متعارف کروایا۔ ان کی وساطت سے ہی غلام احمد پرویز کی تصنیف ''قتلِ مرتد'' ہمیں ملی۔ میٹرک کا سٹوڈنٹ ایک علمی کتاب سے جتنا استفادہ کر سکتا ہے، ہم نے بھی کیا۔ آپ اس سے اندازہ کر لیں کہ کم و بیش ربع صدی گزر جانے کے باوصف نہ صرف اس کتاب کے مندرجات ہمیں اچھی طرح یاد ہیں بلکہ اس حوالے سے پرویز صاحب کے مثبت نقطۂ نظر نے مستقل ہمارے قلب و ذہن میں جگہ بنا لی۔ بعد میں ایسی کئی تقریریں اور تحریریں ہماری سماعتوں اور بصارتوں سے ٹکرائیں جن میں ارتداد کو جرم ثابت کرنے کے لئے بعض روایتی سوچ رکھنے والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا، لیکن سچی بات ہے ان کی ایک بات بھی دل کو نہ لگی۔ اسی طرح غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق پرویز صاحب نے جو صراحت کی، وہ اتنی معقول ہے کہ اس کا ہر جواب

پوچ ہے۔ بعض علمی مجالس میں ہم نے ''رسک'' لے کر اس باب میں بعض ثقہ علماء کرام سے براہ راست استفسارات کر کے بھی دیکھ لیا' لیکن جواباً ہمیں قابل رحم عجز کا مشاہدہ ہی کرنا پڑا اور ہم سوچتے ہی رہ گئے کہ محض ایک شخص کی معاندت اور غیر مستند تاریخ و روایات کی صنم پرستی نے انہیں کیسے دن دکھا دیئے ہیں کہ کائنات کی پاکیزہ ترین شخصیت ﷺ کا تقدس بھی انہیں عزیز نہیں رہا کہ بلا جھجک زبان پر ایسی ناروا باتیں لے آتے ہیں کہ حضور ﷺ سے محبت رکھنے والے ایک عام اور گنہگار مسلمان کی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں راستی کا راستہ دکھائے۔

قصہ مختصر علم و ادب سے وابستگی جیسے جیسے پختگی کے مراحل طے کرتی گئی غلام احمد پرویز مرحوم کی تصانیف کا مطالعہ جاری رہا۔ اگرچہ اس دوران میں کئی پڑاؤ آئے' طویل وقفے بھی آئے ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

1983-85ء کا عرصہ بی۔اے کے طالب علم کی حیثیت سے ایف سی کالج میں گزرا۔ ہوسٹل میں مقیم رہے۔ اچھی طرح معلوم تھا کہ 25/B گلبرگ 2۔ پرویز صاحب کی رہائش ہے۔ یہ بھی خبر تھی کہ آپ ہر ہفتے درس قرآن دیتے ہیں۔ ''ثواب طاعت و زہد'' جاننے کے علی الرغم جانے کیوں طبیعت ادھر نہیں آئی۔ تعلق خاطر جانے کس کس نوع کے دار و رسن کی اور لئے پھرا بس ادھر رخ نہ ہو سکا ''ورنہ قریب تر تھا شبستاں کھلا ہوا''۔ حقیقت یہ ہے سب سے بڑی نعمت' نعمت کی موجودگی کا احساس ہے اور ہمیں بھی اس نعمت کا احساس اس دن ہوا جب یہ نعمت روئے ارض پر موجود نہ رہی۔ ایک دم قدرت اللہ شہاب کے افسانے ''چندراوتی'' کا پہلا فقرہ یاد آیا ہے:

''جب مجھے چندراوتی سے محبت شروع ہوئی۔ اسے مرے ہوئے تیسرا روز تھا......''۔

صاحبو! ہم وہ تاریخی دن کیسے بھول سکتے ہیں' جی ہاں 25 فروری 1985ء (1ے) ہم اپنے کزن سے ملنے ایف۔سی کالج سے ریواز گارڈن گئے۔ واضح رہے ان دنوں ہمارے پاس ایگل کی بائیسکل ہوا کرتی تھی اور پورا لاہور اس کے دو پہیوں کی گردش میں سمٹنے پر مجبور بلکہ ''مجبورِ محض'' تھا۔ وہیں ریواز گارڈن میں اخبار کے پہلے صفحے پر ہماری نظر پڑی' پرویز صاحب کے سانحہ ارتحال کی خبر نے بے کل کر دیا۔ ان کی موت سے زیادہ افسوس ہمیں یہ لاحق ہو گیا کہ اتنا قریب ہونے کے باوجود ان سے مل نہیں سکے' انہیں سن نہیں سکے' ان کی زیارت نہیں کر سکے۔ اسی تاسف نے جسم و جاں میں ایک عجیب سی توانائی بھر دی' اپنی سائیکل اٹھائی' ریواز گارڈن سے سیدھے 25/B گلبرگ پہنچے۔ سفرِ آخرت کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ پرویز صاحب ایک چارپائی پر پڑے ابدی نیند سو رہے تھے۔ ان سے محبت کرنے والے ان گنت احباب ارد گرد موجود تھے' کہیں آنسو رواں ہیں' کہیں دبی دبی سسکیاں تو کہیں قدرے بلند آواز میں گریہ۔ پرویز صاحب کے بھائی (مرحوم) ڈاکٹر عارف بٹالوی سب کو تسلیاں بھی دیتے جاتے تھے اور خود روتے بھی جا رہے تھے۔ ہم نے بار بار جی بھر کے اس عظیم انسان کو دیکھا جس نے ایک

عہد کو متاثر کیا تھا۔ برآمدے میں ایک عمر رسیدہ شخص اونچی آواز میں اپنے محسن پرویز صاحب کو یاد کر رہا تھا۔ اس کا نام مرزا سلطان بیگ (نظام دین) تھا۔ جنازہ روانہ ہوا۔ ہم بھی اس جلوس میں شامل رہے۔ منی مارکیٹ کی گراؤنڈ میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ تدفین کا مرحلہ آیا تو بھی ہم موجود رہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے ان کے کسی عزیز نے دور سے (غالباً کراچی سے) پہنچنا تھا' چنانچہ تدفین کے مرحلے کو کچھ مؤخر کر دیا گیا کہ فلائٹ کا انتظار کیا جانے لگا۔ اس دوران میں کہ ان کی آخری آرامگاہ تیار ہو چکی تھی' پاس چارپائی پر ان کی میت پڑی تھی۔ قریب ہی جناب حنیف رامے نے اپنی چادر بچھا دی۔ ہم لوگ ان کے کہنے پر وہاں بیٹھ گئے۔ ان دنوں رامے صاحب کا ایک مضمون جو روزنامہ ''جنگ'' میں چھپا تھا' بے حد متنازع ہونے کی وجہ سے ہر حلقے میں موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ اس خاکسار نے اس مضمون کی بابت رامے صاحب سے جو دو ایک سوالات پوچھے تو اچھی خاصی محفل جم گئی۔ بڑی گرما گرم باتیں ہوئیں۔ واپس آ کر اس گفتگو کے تضمنات پر مبنی اور پرویز صاحب کے آخری سفر کی روداد' جو دس بارہ صفحات پر مشتمل تھی' ہم نے رحیم صاحب کو خط کی صورت میں بھیجی تھی' کیا عجب ان کے پاس یہ مفصل خط محفوظ ہو۔

بہرنوع وقت کا دریا اپنے غیر متعین تعینات کے ساتھ بہتا رہا۔ ہم ''طلوع اسلام'' کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے رہے۔ ایک آدھ کنونشن میں شریک ہونے کی سعادت بھی ملی۔ کبھی کبھار پرویز صاحب کی کسی کتاب میں سے بھی گزرنے کا موقع ملتا رہا۔ ''فکر پرویز'' سے تعلق رکھنے والے دوستوں' اسلم صابر صاحب' محمود الحسن صاحب' ڈاکٹر اسلم نوید صاحب اور دیگر منسلکین سے رابطے رہے' مکالمات کا تبادلہ ہوتا رہا' ذہنی افق پھیلتا رہا۔ لیکن حق یہ ہے کہ پرویز کو پڑھنے اور سمجھنے کا حق ابھی ادا نہیں ہوا تھا۔ اب سے کوئی تین سال قبل کی بات ہے کہ یہ عاجز بسلسلہ ملازمت ساہیوال میں مقیم تھا۔ وضاحت کر دیں کہ ہمارا تعلق شعبہ تدریس سے ہے۔ کوئی 15/16 سال ہو گئے ہیں' مختلف کالجوں میں پڑھاتے ہوئے۔ 2001ء میں جب ڈسٹرکٹ گورنمنٹس کا ڈول ڈالا گیا تو ہماری رضا معلوم کیئے بغیر ''جبراً'' ہمیں کلاس روم سے اٹھا کر آفس میں بھیج دیا گیا۔ ممکن ہے عامیوں کی نگاہ میں ''ڈائریکٹر کالجز'' ہونا عزت کی بات ہو پر ہمیں تو یہ سراسر قید بامشقت کے مشابہ عمل محسوس ہوا۔ لہٰذا دو اڑھائی سال مسلسل سفارشیں ڈھونڈتے رہے کہ کوئی ''رجل غیب'' ہمیں اس جھنجٹ سے نجات دلا دے' ہم باز آئے اس ''ایجوکیشن افسری'' سے۔ سیدھی سی بات ہے ہم تو انہیں لفظ وحرف ہی ماننے کو تیار نہیں جو لٹریچر (علم و ادب) سے واسطہ نہ رکھتے ہوں اور یہاں تو اعداد تھے' ہندسے تھے' لایعنی میٹنگز تھیں' انکوائریاں تھیں ٹیکنیکل انسپیکشنز تھیں' فزیبلٹی رپورٹس تھیں' Expenditure State Ments تھیں' آڈٹ تھے' جی حضوری کی ایک زنجیر تھی۔ دستور یہی تھا کہ اوپر والوں کی ہر نامعقول بات ہنسی خوشی سہو اور نیچے والوں پر خوب خوب رعب گانٹھو۔ کیا عرض کریں اس افسری لائن میں تلخیاں ہی تلخیاں تھیں' چنانچہ اب بھی یہ گنگناتے رہتے ہیں' ''جنہیں ہم بھولنا چاہیں وہ ''افسر'' یاد آتے ہیں۔''

خیر وہ جسے Good out of Evil کہتے ہیں۔ اس کی رو سے مذکورہ اذیت بلکہ ''شر'' میں سے ہمیں بھی خیر کے کچھ

پہلو ضرور ملے۔ میر دردؔ نے کیا عمدہ شعر کہا ہے

خیر و شر کو سمجھ کہ ہیں دو زہر
سانپ کی زیست ہی تجھے سم ہے

یہ درست کہ لمحۂ موجود میں ہم آزاد ہیں، اس ''سمناک'' ماحول سے ہمیں چھٹکارا مل چکا ہے لیکن یہ بہت بڑا سچ ہے کہ اگر اس Misery کا ہمیں ذاتی طور پر تجربہ نہ ہوا ہوتا، زندگی کی سفاک جہتوں کے ہم خود شاہد نہ ہوتے تو ممکن ہے پرویز صاحب کی تصانیف میں موجود ''زندگی کے زہر'' کو نوشِ جاں کرنے کی صلاحیت سے عاری رہتے۔ وہی بات

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طُور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

صاحبو! آپ ذرا سوچیے وہ فرد جس نے چالیس برس مذہبی گھرانے، مذہبی معاشرے میں بتائے ہوں کیا وہ مذہب کے بغیر لقمہ بھی توڑ سکتا ہے؟ نہیں جناب یہ قریب قریب ناممکن ہے۔ اس فرد کے طرزِ احساس کی بُنت میں مذہب کا Fibre بنیادی تانے بانے کے طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر اتفاق سے کوئی ایسا واقعہ اس فرد کے ساتھ پیش آ جائے کہ اسے ''بدنصیبی'' سے اپنے مخصوص مذہبی نظریات کو خالص معروضیات کی دھوپ میں کھینچنا پڑ جائے، غیر جانبدار ہو کر ان کا جائزہ لینا پڑ جائے، ہر خوش عقیدگی کو منہا کر کے ان کا تجزیہ کرنا پڑ جائے تو عین ممکن ہے نتائج کی بے رحم صورت دیکھ کر اس فرد کو ہارٹ اٹیک آ جائے اور وہ سچائی کی تاب نہ لا کر اس دنیا سے ہی کوچ کر جائے۔

دوستو! یہ خاکسار عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کے بہت بڑے عالم پرویز کو اپنا محسن کیوں نہ قرار دے کہ ہمیں موت کی وادی سے بچانے والا یہ واحد بندہ ہے۔ بات جسمانی موت کی نہیں، مسئلہ ذہنی موت کا ہے۔ ہمیں پرویز نے ذہنی موت سے بچایا ہے۔ خوش قسمت ہے وہ انسان جو ذہنی موت سے قبل جسمانی طور پر مر جائے اور بدقسمت ہے وہ انسان جو ذہنی موت کے بعد جسمانی سطح پر زندہ رہے۔ کوئی اس عذاب کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

دفتری زندگی کے دوران ایک مرتبہ نہیں ان گنت مرتبہ ایسا ہوا کہ زندگی بغیر کسی آراستگی کے، بغیر کسی ورق کے، ہر Drapery سے مکمل بے نیاز سامنے آتی رہی۔ ایسے لمحے بار بار آئے کہ غیبی قوتوں کی اشد ضرورت محسوس ہوئی، لیکن یہ کیا کہ Stretch the Truth والا فارمولا بلکہ مجرب نسخہ بھی آزما کر دیکھ لیا، پر ہوا کچھ نہیں، جو زمینی حقائق تھے، وہ جوں کے توں رہے، جو سچ تھا، وہ وہی رہا۔ اسباب کا جادو ہی سر چڑھ کے بولا، علت اور معلول کے پیچ رشتے کی توانائی اس شدت سے ابھر کر سامنے آئی کہ I was Stumped.

طاقچے کے خطوط پڑھتے پڑھاتے عمر بیت گئی تھی، کچھ پلے نہیں پڑا تھا، یہ پرویز ہی تھا جس نے اقبال کے یہ شعر یوں سمجھائے کہ ہمیں ''کلیاتِ اقبال'' میں انہیں اس نیت سے تلاش کرنا پڑا، کہیں یہ اشعار پرویز نے خود گھڑ کر تو اقبال سے منسوب

نہیں کردیئے، آپ بھی سنئے:

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

جی ہاں صاحبو! یہ پرویز صاحب کی ''کتاب التقدیر'' تھی جس کے بالاستعیاب مطالعہ نے وہ گرہ کھول دی جو ذہن میں بیس برس سے پڑی ہوئی تھی، کس کس نکتہ ور کی بارگاہ میں ناصیہ فرسائی نہیں کی تھی ہر کہیں سے ایک سا ہی جواب موصول ہوا تھا۔ ''نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی''۔ اس معرکہ آرا کتاب کے مطالعہ کے بعد سب سے پہلے تو اپنے اللہ سے ہاتھ باندھ کر معافی مانگی کہ یارب الارباب! اس عاصی کو معاف کردے کہ اب تک اپنا ہر جرم تیرے کھاتے میں ڈالتا آیا ہوں۔ تیرے قادر ہونے کا مفہوم اصفیاء وعلماء نے مجھے یہی سمجھایا تھا کہ گناہ کی توفیق بھی تو دیتا ہے، نیکی کی سعادت بھی تو ہی بخشتا ہے۔ گمراہ بھی تو کرتا ہے، ہدایت کے جادے پر بھی تو ہی گامزن کرتا ہے۔ بندہ مجبور ہے، تیرے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہے، مختاری کی تہمت سے مہتم ......لیکن یہ پرویز تھا جس نے قرآن کھول کر دکھایا کہ نہیں نہیں یہ پاک خدا پر الزام ہے، اس نے تو ہر انسان کو مکمل اختیار دیا ہوا ہے اور پھر اس نے وہ آیات ایک ایک کر کے سمجھائیں جن میں تضاد محسوس ہوتا تھا، جو خدا کو غیر عادل ثابت کرتی تھیں، بے انصاف بتاتی تھیں۔ بندے کو مجبور صورت میں پیش کرتی تھیں۔ جب سارے عقدے کھل گئے تو زبان اپنے آپ یہ تلاوت کرنے لگی:

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا نہ منشائے خدا
حادثے مجھ پہ جو گزرے مرے حالات میں
تھے

ضمناً پرویز صاحب نے ہی وضاحت کی، قرآن مجید کی کوئی آیت تو دور کی بات ہے، ایک نقطہ، شعشہ تک بھی منسوخ نہیں۔ ورنہ بڑے بڑے زہاد پانچ سات آیتوں کے سامنے دم بخود یہ اقرار کرتے پائے گئے: اے آیتو! تم پر تو عمل نہیں ہوسکتا۔

سبحان اللہ یہ کریڈٹ اس پرویز کے کھاتے میں ہی لکھا جائے گا جسے سارے علماء صبح وشام کافر کافر کہتے نہیں تھکتے۔ آپ یقین کیجئے مسئلہ تقدیر سمجھ میں آنے کے بعد اس عاجز کو وہی لذت محسوس ہوئی جو پوری تحقیق کے بعد کسی نومسلم کو قبول اسلام کی ملکوتی ساعت میں محسوس ہوتی ہوگی۔

غلام احمد پرویز کا دوسرا بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے ختم نبوت کا حقیقی مفہوم سمجھایا تفصیل پھر کبھی سہی، اجمالاً اتنا عرض ہے کہ احمدیوں کے ساتھ ہمارا بڑا وقت گزرا ہے۔ ہم نے ان لوگوں کو مجموعی طور پر اچھے کردار والے انسان پایا ہے، شرافت اور علم

تقریباً ہر احمدی کے امتیازی اوصاف ہیں کہ ان کی جماعت منظم ہے، تربیتی نظام مثالی ہے لیکن ان لوگوں کے اعتقادات ریت کی دیوار ہیں۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کیوں معروضی بنیادوں پر اپنا جائزہ نہیں لیتے؟ ہم اپنے طور پر اس کی دو وجوہ تلاش کر سکے ہیں۔ پہلی یہ کہ ہمارے علماء نے اس جماعت کے خلاف نفرت کی ایسی فضا تیار کی ہے کہ یہ لوگ اپنے کمزور عقیدوں کے ساتھ اور زیادہ مضبوطی سے جڑ گئے ہیں۔ اگر انہیں پیار کے ساتھ بات سمجھانے کی کوشش کی جاتی تو آج نتائج یکسر مختلف ہوتے۔ دوسری بات بھی خاص اہمیت کی حامل ہے کہ ختم نبوت کے باب میں عام مسلمانوں کا قریب قریب وہی موقف ہے جو خود قادیانیوں کا ہے۔ جی ہاں ایک آنے والے کا عقیدہ مسلمانوں کی میراث ہے۔ ''ہم نے احمدی علماء VS علمائے اسلام'' کافی مناظرے سنے ہیں۔ ہمیشہ یہی دیکھا کہ عام سے احمدی نے بھی اچھے بھلے عالم دین کو وہ عبارات دکھا کر لاجواب کر دیا جن میں غیر تشریعی نبوت کے اجرا کو ہمارے اکابرین نے تسلیم کیا ہے۔ اب یہ اکابرین عامی شامی نہیں، جید ہستیاں ہیں۔ اس نازک صورتحال میں علماء کرام اسی معروف تاویل کا سہارا لیتے ہیں کہ غیر تشریعی نبی سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ہے وہ چونکہ آسمانوں پر زندہ موجود ہیں، آخری زمانے میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے لئے تشریف لائیں گے۔ اس پر ذہین احمدی فوراً یوں گرفت کرتے ہیں۔ جناب! اصل چیز پھر ''ضرورت نبوت'' ہوئی۔ اگر تجدید و احیائے دین کے لئے پرانا نبی آ سکتا ہے تو نیا کیوں نہیں؟ اور پھر وہ نیا جو قرآن کو منسوخ کرنے والا نہ ہو، حضور ﷺ کا امتی ہو۔ نیز ختم نبوت کے پھر معانی یہی ہوئے کہ حضور ﷺ فضیلت کے اعتبار سے سب سے بلند درجہ نبی ہیں، آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی پیروی میں کوئی نبی مبعوث ہو جائے تو آپ ﷺ کی ختمیت مرتبی متاثر نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کی آمد نو کے بعد متاثر نہیں ہوگی کیونکہ وہ اللہ کے نبی ہوں گے اور مسلم شریف کی احادیث کے مطابق ان پر وحی بھی اترے گی۔

دوستو! یہ جری شخص غلام احمد پرویز تھا جس نے قرآن کی رو سے توضیح کی، ختم نبوت کا مطلب ہے، حضورؐ ہر لحاظ سے آخری نبی ہیں۔ اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، پرانا نہ نیا۔ قرآن بار بار شہادت دیتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام بھی اسی طرح وفات پا چکے ہیں جس طرح تمام انبیاء کرام رحلت فرما گئے ہیں۔ چنانچہ اب کسی کی آمد کا سرے سے کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ ختم نبوت کا مطلب ''ضرورتِ نبوت'' کا خاتمہ ہے۔ اب ہدایت کا سرچشمہ صرف اور صرف قرآن ہے، کوئی نئی وحی نہیں، حتیٰ کہ کسی مترادف نام و متبادل عنوان سے بھی اللہ کا کلام کسی بندے پر نازل نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ کا کلام حجت ہوتا ہے، اب قرآن کے بعد جو اس حجت کو بیچ میں لائے گا، وہ امت کو نئی تقسیم سے دوچار کرے گا۔

ویسے جملہ معترضہ کے طور پر ذرا غور کیجئے کہ احمدیوں کا مسئلہ سلجھانا کتنا آسان تھا یہ لوگ وفات مسیحؑ کے پہلے ہی قائل ہیں۔ انہیں صرف خاتم النبین کا مفہوم سمجھانے کی ضرورت تھی۔ انہیں بتایا جاتا کہ آیات روایات پر مقدم ہیں۔ جب آیات یہ اصولی فیصلہ دے رہی ہیں کہ نئی نبوت ممکن ہی نہیں تو آپ اس فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیں، کسی اور طرف آپ کو دیکھنے کی

ضرورت ہی نہیں۔ واضح سی بات ہے کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ قول رسولؐ اور آیت ربانی میں تناقض ہو۔ جب اللہ کی کتاب کہہ رہی ہے حضور ﷺ آخری نبی ہیں اور حضرت عیسیٰؑ وفات پا چکے ہیں تو پھر حضور ﷺ کا نقطہ نظر اس سے ہٹ کر کیسے ہو سکتا ہے؟ نتیجہ معلوم! دیکھنے والی چیز یہ ہے کہ از سر نو جائزہ لیا جائے وہ فرامین جو حضور ﷺ سے منسوب کئے جا رہے ہیں کیا وہ حضور ﷺ کے ارشادات ہیں بھی یا نہیں؟ پرویز صاحب نے ہی قوم کو سمجھایا کہ حدیث رسولؐ رہنمائی کا بلاشبہ سرچشمہ ہے لیکن یہ طے ہونا از بس ناگزیر ہے کہ جسے حدیث رسول ﷺ کہا جا رہا ہے وہ حدیث رسول ﷺ ہے بھی یا نہیں؟ اور ساتھ ہی انہوں نے بہترین معیار بھی مقرر کر دیا ہے کہ جو قول قرآن کے مطابق ہے وہ قول رسولؐ ہے جو اس کے برعکس ہے وہ قول رسول ﷺ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس تناظر میں پرویز کو منکر حدیث کہنا سراسر ناانصافی ہے یا نہیں؟

غلام احمد پرویز کی علمی خدمات کا مختصر جائزہ بھی کئی جلدوں کی کتاب میں لیا جا سکتا ہے۔ وقت آئے گا ان پر بڑی بڑی یونیورسٹیاں تحقیقی مقالے لکھوائیں گی، تب امت مسلمہ کو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا شخص ان میں ہو گزرا ہے۔ ایسا شخص جس نے مدت العمر قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ سے ایسا عدیم النظیر عشق کیا کہ واقعتاً دور دور تک مثال دکھائی نہیں دیتی۔ پچاس سے زائد تصانیف چھوڑ کر جانے والے پرویز نے کہیں نہیں کہا کہ میرا کہا حرفِ آخر ہے۔ انہوں نے عمر بھر عجز و انکسار کی ردا اوڑھے رکھی اور یہی کہتے رہے کہ میں قرآن کا معمولی طالب علم ہوں، جس طرح مجھے سمجھ آئی، خلوصِ نیت سے اسی طرح آگے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ یہی بنیادی وجہ ہے کہ اتنا اہم علمی خزینہ تخلیق کرنے والے پرویز نے کسی فرقے کی بنا نہیں رکھی۔ ان کی جماعت وہی تھی جو رسول کریم ﷺ کی جماعت تھی۔ ظاہر ہے اللہ کے نبی نے اپنی امت کو فرقوں میں بانٹنا تو درکنار دیکھنا بھی پسند نہیں کیا، اسی لئے پرویز صاحب نے بھی علامہ اقبال کی طرح بس ایک فکر دی ہے، اب اس نابغہ عصر کی فکر سے پوری کی پوری امت کتنا نور کشید کرتی ہے، یہ اس پر منحصر ہے۔ انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک قرآن مجید کی شرح اپنی ضخیم تصانیف میں محفوظ کر دی ہے۔ جو ایک مربوط نظام فکر سے بجا طور پر معنون کی جا سکتی ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ روشنی کے اس مینار سے استفادہ کرتے ہوئے اس قرآنی معاشرے کی تشکیل کریں جس میں مسرتیں ہوں، بدعنوانیاں نہ ہوں، محبتیں ہوں، خوشحالیاں ہوں، انسانی ذوات نشوونما پائیں، امن ہو، فساد نہ ہو، افلاس کا عذاب نہ ہو۔ سب اپنے سوہنے اللہ کے قوانین کی اطاعت کریں اور اس کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا ہی پیار کریں جتنا ان کی خوبصورت ذات سے ان کے دوستوں حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمر فاروق ؓ۔ حضرت عثمان غنی ؓ۔ حضرت علی مرتضیٰؓ اور دیگر مخلص احباب رضی اللہ تعالیٰ عنھم کو تھا۔

☆......☆......☆

علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شعلۂ نمناک [1]

طلوعِ اسلام کی چھٹی سالانہ کنونشن منعقدہ گلبرک، لاہور

13 تا 15 اپریل 1962ء

(روئیداد، ماخوذ از طلوعِ اسلام مئی، جون 1962ء)

تمہید

بادہ مستانِ حرم کے شوق و مستی کی بساط
بچھ رہی ہے پھر سحابِ نور کی آغوش میں

صدیوں کے پے در پے اور ناکام تجربوں نے نوعِ انسانی کو مایوسی اور شکست کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں لا کھڑا کیا ہے۔ ذہن انسانی کی مسلسل کاوشیں صحرائے نامرادی میں دم توڑ رہی ہیں اور کوئی نشانِ منزل نگاہوں کے سامنے موجود نہیں۔ نوعِ انسانی نامرادیوں اور حرماں نصیبوں کے اس نازک مرحلے سے دوچار تھی اور فضائے کائنات پر مایوسیوں کا یہ اندوہناک سماں طاری تھا کہ فضاؤں میں ایک انوکھی اور دلنشین آواز، فردوسِ گوش بنتی سنائی دی۔ یہ آواز انسانی نجات و سعادت کے اس آخری اور مکمل ضابطۂ حیات کی نقیب تھی جو چودہ سو سال قبل خالقِ کائنات اور رب العالمین کی بارگاہِ عظیم سے حضور رسالت مآب ﷺ کی وساطت سے انسانوں کو عطا ہوا۔ اور اپنی عالم آرائی کے درخشندہ اور حسین نقوش صفحۂ ارض پر قائم کرنے کے بعد اب ریشمی غلافوں میں لپٹا پڑا تھا۔

یہ تھا تاریخ انسانی کا وہ نازک مرحلہ جبکہ ''طلوعِ اسلام'' نے عراقِ دلنشیں کے اس ساز کو چھیڑا۔ اور کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈھلے ہوئے نغمے اس کے کالموں میں گونجنے لگے۔ گزشتہ چوبیس [2] سال سے یہ دعوتِ انقلاب ہزاروں قلوب و اذہان میں اپنی

---

[1] ساقیا! برجگرم شعلۂ نمناک انداز   دگر آشوب قیامت بکفِ خاک انداز

[2] طلوعِ اسلام کے دورِ اوّل کا اجرا 1938ء میں ہوا تھا۔

صداقت کے نقوش قائم کرتی جا رہی ہے۔ اس کے عالم آرا مقاصد نکھر اور اُبھر کر منظرِ عام پر آ رہے ہیں اور اب نہ صرف پاکستان، بلکہ بیرونِ پاکستان میں بھی، جگہ بجگہ اسے پُرخلوص اُمنگوں اور انتہائی تڑپ اور خلش سے لبیک کہا جا رہا ہے۔

پس منظر:

نومبر 1956ء میں طلوع اسلام کنونشن کے نام سے پہلی بار اس تحریک کے ہم نوا اور اس فکر سے ہم آہنگ احباب کا اولین اجتماع لاہور میں ہوا۔ اور اس دعوتِ قرآنی کو منظم طور پر آگے بڑھانے کے لئے رابطہ باہمی اور مشاورت کی خوشگوار صورت سامنے آئی۔ اگلے سال راولپنڈی نے اس سلسلہ میں اپنے مہمانوں کی میزبانی کی اور پھر اس کے بعد لاہور کی سرزمین کو ان مسلسل سالانہ اجتماعات کے خیر مقدم کا شرف حاصل ہوتا چلا آیا۔ طلوع اسلام کنونشن کے اس چھٹے سالانہ اجتماع کے لئے قرعہء فال بھی لاہور ہی کے نام پڑا۔ اور موسم بہار کی شاداب فضاؤں میں گلبرگ ایک وسیع و عریض بنگلہء آراستہ و پیراستہ ہو کر، قرآنی فکر کے طائرانِ پیش رس کے سالانہ اجتماع کا نشیمن قرار پا گیا۔

لاہور، جسے بجا طور پانچ دریاؤں کی عروسِ بہار کا دھڑکتا ہوا دل کہنا چاہیئے، اپنی پنہائیوں میں عظمتِ رفتہ کے کتنے ہی نقوشِ تابندہ اور گہر ہائے رخشندہ کو سمٹائے ہوئے ہے، لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے تو اس کی دھڑکنیں نشید قرآنی کے جن زمزموں سے مالا مال چلی آ رہی ہیں، اس کا اعزاز کسی دوسرے شہر کو حاصل نہیں۔ اپریل 1938ء تک اسی خیابانِ آرزو سے اقبالؒ کا یہ نغمۂ حیات گونجتا رہا کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جُز بقرآں زیستن

اور پھر مشرق کا یہ آتش نوا فقیر ہم سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا کہ

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

لیکن اس نالہء فراق کے ساتھ اس کی یہ نوید جانفزا بھی سنائی دی کہ

بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

یہ مبداءفیض کی کرم گستری کا اعجاز تھا کہ عین اس وقت جبکہ اس دانائے راز کے ماتم میں خون کے آنسو بہائے جا رہے تھے، طلوع اسلام کی ننھی ننھی کرنیں یہ نغمہ الاپتی منظر عام پر آ گئیں کہ

اگرچہ میکدہ سے اُٹھ کے چل دیا ساقی
وہ مے وہ خُم وہ صراحی وہ جام باقی ہے

وقت کا قافلہ رواں دواں آگے بڑھتا گیا۔ ''دولتِ پرویز'' اقبال کی نواؤں کا صلہ بن کر اس کے قافلے میں لٹتی چلی گئی۔

طلوع اسلام کی پہلی کرن، اقبال کے ماتم میں سیاہ پوش ہو کر منظر اشاعت پر آئی تھی۔لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اس کے نور بصیرت کی امین وترجمان اور پاسبان بھی قرار پاگئی۔قرآنی فکر کی نشرواشاعت کا یہ حسین وجمیل سلسلہ اپریل 1938ء سے فضاؤں کو تابناک بنائے چلا آرہا ہے۔تقسیم ہند سے پہلے دہلی کا دارالحکومت اس مقصدِ عزیز کا سرچشمہ تھا۔حصولِ پاکستان کے بعد دارالحکومت کراچی کو اس کا مرکز بننے کا شرف حاصل ہوا اور پھر 1958ء سے خود اقبال کے لاہور نے اپنی چشم انتظار اس کی راہ میں بچھادی۔اب چارسال سے لاہور نہ صرف طلوع اسلام کا مرکز اور قرآنی فکر کا سرچشمہ بلکہ مفکر قرآن کا مسکن بھی ہے۔اس کا یہی اعزاز طلوع اسلام کنوینشن کے سالانہ انعقاد کے لئے وجہ جواز بن جاتا ہے۔اوراسی بنا پر یہ ضروری ہوگیا کہ کنونشن کے چھٹے سالانہ اجتماع کے لئے بھی نگہ انتخاب اسی کے حق میں فیصلہ کرے۔

کنونشن کی تیاریاں:

نئے حالات کے نئے تقاضوں میں، اس سالانہ کنونشن سے متعلق بزمہائے طلوع اسلام پہلے سے کہیں بڑھ کر دلچسپیوں اور ذوق وشوق کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور منتظمین کے لئے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ اس مقصد کے پیش نظر ایسی جگہ تلاش کی جائے جو ان بڑھتی ہوئی ضروریات کے شایانِ شان کفیل ثابت ہو۔بعد از تلاش بسیار ای/128 سی سکیم گلبرگ 3 کا طویل وعریض بنگلہ سامنے آیا اور مالکان نے بمسرت اسے کنونشن کمیٹی کے سپرد کردیا۔ یہ بنگلہ زیر تعمیر تھا اور اس کی وسعتوں میں سامانِ تعمیر کے ڈھیروں کے ڈھیر پھیلے ہوئے تھے۔سہ روزہ عارضی ضروریات کے لئے بہت سی فوری لیکن عارضی تعمیرات کی بھی ضرورت تھی۔ پانی، بجلی اور ٹیلیفون کے کنکشن بھی اشد ضروری تھے۔کنونشن کی تاریخیں تیزی سے قریب آرہی تھیں اور کنوینشن کمیٹی کو چند دنوں کے مختصر سے وقفے میں بڑے اہم اور ضروری انتظامات سے عہدہ برآ ہونا تھا۔مسئلہ بڑا کٹھن تھا لیکن خارہ شگافیاں دشتِ قرآنی کی ہمت نے اس ویرانے میں جہاں مواصلات تک کا کوئی ادنیٰ انتظام نہیں تھا، ایک نئی دنیا بسادی۔ ہر کام تیزی اور خوش اسلوبی سے تکمیل پانے لگا اور بارہ اپریل کی صبح کو، جبکہ ملک کے دوردراز گوشوں سے نمائندگان کی آمد آمد شروع ہوئی، ہر شے حسنِ ترتیب کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی مہانوں کے لئے چشم براہ تھی۔

احباب کا داخلہ:

12 اپریل کی صبح کو طلوع آفتاب کے فوراً بعد کنونشن ہاؤس میں احباب کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔دوردراز کی بزموں کے نمائندے مختلف ٹرینوں اور بسوں سے سارا دن لاہور پہنچتے رہے۔ لاہور پہنچ کر گلبرگ کے دور افتادہ ویرانوں میں کنونشن ہاؤس کو تلاش کرنا، پہاڑوں سے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ یہ کٹھن مرحلہ بھی کسی نہ کسی طرح طے ہوتا رہا۔تلاشِ منزلِ لیلیٰ میں تھکے ماندے قیس درمقصود پر پہنچ کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ آتے۔اور کنونشن ہاؤس کی آغوشِ عاطفت خیر مقدم کہتے ہوئے انہیں اپنے دامن میں سمیٹ لیتی۔مختلف کمروں میں چارپائیوں کا

سلسلہ پھیلتا چلا گیا اور جب سورج افقِ مغرب میں غائب ہو رہا تھا تو مہمانوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے کمرے مسکراہٹوں اور قہقہوں کی تازہ بستیاں آباد کر چکے تھے۔ ایوانِ کنونشن رنگا رنگ کے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ اس وقت تک اس کاروانِ شوق کے قافلہ سالار جناب پرویز بھی کنونشن ہاؤس پہنچ گئے تھے۔ ان کی تشریف فرمائی اور ایک ایک کمرے میں پہنچ کر ہمصفیرانِ چمن سے ان کی ہم آغوشیوں نے اس فضا کو مزید رنگینیاں اور شادابیاں بخش دیں۔ میر کارواں کی آمد! یوں سمجھئے۔

اِک جہانِ تازہ کی صبحِ نمود
اِک حیاتِ نو کی شامِ افتتاح

ماحول کے ویرانوں میں مسرتوں اور قہقہوں کا یہ ہجوم زبانِ حال سے یہ گیت گا تا سنائی دے رہا تھا کہ

کانٹوں کو سنبل وگل وریحاں کریں گے ہم
ذروں کو آفتابِ درخشاں کریں گے ہم
روشن کریں گے حق وصداقت کی مشعلیں
باطل کی ظلمتوں میں چراغاں کریں گے ہم

فضا مسرت بھرے قہقوں سے گونج رہی تھی اور رات کے کھانے سے فراغت پا کر سب تعارفی اجلاس کے منتظر تھے کہ یکا یک برقی رو بھی وفورِ مسرت کے ان ہنگاموں سے متاثر ہوئی۔ اور تاروں کو جلاتے اور شعلے برساتے ہوئے آنِ واحد میں اُس نے روشنی کا سارا انظام تہ وبالا کر کے رکھ دیا۔ اب کمرے شبِ دیجور کی تاریکیوں کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ایوانِ کنونشن پر الگ ہجر کا سا سماں طاری تھا اور روشنی کی باز آفرینی کئی گھنٹوں تک ناممکن ہو کر رہ گئی۔ رات کا تعارفی اجلاس مجبوراً اگلی صبح پر ملتوی کرنا پڑا۔ اس سے صبح کے اجلاس کی اہمیت کافی بڑھ گئی۔

اس تعارفی اجلاس کو اب صبح کے افتتاحی اجلاس سے ہم آویز ہونا تھا اور ستاروں کی چشمکیں برملا کہہ رہی تھیں کہ

دمِ سحر انکشاف ہوگا جو فیض ہے موج شبنمی کا !!
گلوں کے دل پر کریگی سجدے وہ پتی پتی کہ باوضو ہے

جھلملاتے ہوئے ستاروں اور اذانِ سحر کی دلکشی 13 اپریل کی صبحِ بہار کے نقیب بن گئے۔۔ احباب انگڑائیاں لے لے کر بستروں سے اٹھ بیٹھے۔ اور تھوڑی دیر بعد قرآن کے یہ شیدائی صفیں باندھے کھڑے تھے اور نشید قرآنی کے تاثر سے نگاہیں نمناک تھیں۔ نماز کے بعد احباب نے جلدی جلدی غسل اور ناشتہ وغیرہ سے فراغت حاصل کی۔ اب سب کا رُخ پنڈال کی طرف تھا اور ایوانِ کنونشن کے دروازے سے انہیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ پہلے اجلاس میں حسبِ معمول تعارف ہوا۔ پھر استقبالیہ اور ناظم ادارہ کی رپورٹ۔

پرویزؔ صاحب کا استقبالیہ خطاب:

اس کے بعد پرویزؔ صاحب اپنا استقبالیہ خطاب لے کر اسٹیج پر تشریف لائے۔ اس خطاب کا عنوان تھا۔

ساقیا! برجگرم شعلۂ نمناک انداز

دگر آشوبِ قیامت بکفِ خاک انداز

احباب کا خیر مقدم کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے اسے مبداء فیض کی کرم گستری سے تعبیر کیا کہ ان کی حقیر سی کوشش اب بے مثال کامرانیوں سے سرفراز ہے اور ان کے مٹھی بھر بے سروسامان ساتھیوں نے حالات کی نامساعدت کے باوجود جس سعی مشکور سے کام لیا ہے اس کی بدولت دعوتِ قرآنی کے پرچے، یورپ اور امریکہ تک پہنچ گئے ہیں۔ پرویزؔ صاحب نے اس یقینِ کامل کا اظہار کیا کہ ان کی امیدیں اور آرزوئیں لازماً ایک حقیقت ثابتہ قرار پائیں گی۔ اور ایک ایک آواز اس کی تائید پر مجبور ہو جائے گی۔

تحریک کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے فرمایا کہ ہم مطمئن ہیں کہ نشرواشاعت کے سلسلے میں ہمارے وسائل کی کمی مخالفین کے زور مخالفت سے پوری ہو رہی ہے۔ مخالفین کے بے پناہ پروپیگنڈہ نے جس تیزی سے ہمارے مقاصد کی تکمیل کی ہے وہ ہمارے حیطہء تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ انہوں نے پورے اعتماد سے اعلان کیا کہ قرآن کی آواز کو اب روکا نہیں جاسکتا اور مخالفت کی خس وخاشاک اس کے سیلِ رواں کی روانی میں حائل نہیں ہو سکے گی۔

پرویزؔ صاحب نے تحریک کے ''نادان دوستوں'' کو خاص طور پر متوجہ کیا اور ان پر واضح کیا کہ ہمارے دشمن اس تحریک کو اس نقصان کا عشرعشیر بھی نہیں پہنچا سکتے جو نادان دوستوں کی غیر ذمہ دارانہ روش کے ہاتھوں پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ قرآنی تحریک کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے احتیاط سے کام لیں اور ایسی باتوں سے اجتناب کریں جو اس معاملہ میں غلط فہمیوں کا باعث ہوں۔

پرویزؔ صاحب نے احباب پر واضح کیا کہ معاملہ قرآن کو سمجھ لینے پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ سیرت وکردار کو قرآن کے سانچوں میں ڈھالنے کی اشد ضرورت ہے۔ جس انقلاب کو ہم محسوس ومشہود پیکروں میں دیکھنا چاہتے ہیں، اسے سب سے پہلے ہمارے قلوب کی گہرائیوں میں جاگزین ہونا چاہیئے۔

مفکرِ قرآن کا یہ خطاب قرآنی فکر کے طائرانِ پیش رس کے لئے نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس خطاب میں انہوں نے تحریک کے ہر گوشے کو وضاحت کے ساتھ نمائیندگان کے سامنے پیش کیا۔ اور ہر نقطہء نظر سے انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ اختتام پر انہوں نے اس عزم کا اظہار فرمایا کہ

مے خانہ سلامت ہے تو ہر سرخیء مے سے تزئینِ در وبام حرم کر کے رہیں گے

شعلۂ نمناک

یارانِ ہم سفر کے نام

دریں صحرا گزر افتاد شاید کاروانے را پس از مدت شنیدم، نغمہ ہائے ساربانے را

عزیزانِ ہم عناں، سلام ورحمت!

ایک سال کی مدتِ فراق بڑی طویل صبر آزما ہوتی ہے۔ لیکن میں اس کی زہرہ گدازی وجگر خراشی کو کم کرنے نے لئے کرتا یہ ہوں کہ جب کبھی کچھ لکھتا ہوں تو آپ احباب کو تصور میں سامنے رکھ لیتا ہوں۔ اور چونکہ لکھتا رہتا ہوں سال بھر برابر، اس لئے آپ مجھ سے کسی وقت بھی جدا نہیں ہوتے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس طرح میں فراق کی گھڑیوں کو وصال کے لمحات میں بدل لیتا ہوں، اور ہر پوچھنے والے سے ایک تبسم زیر لبی سے کہہ دیتا ہوں کہ

بیادِ گیسو ورخسارِ یار گزری ہے بڑے مزے میں شبِ انتظار گزری ہے

لیکن یہ تسکین بہرحال ایک خوشگوار فریب سا ہوتا ہے۔ اس کی جدائی کی کوفت، فی الواقعہ اس وقت دور ہوتی ہے جب آپ احباب اپنی محبت وخلوص کے خرمنِ گل لئے، وجہ شادابیٔ قلب ونظر ہو جاتے ہیں، اور یوں سال بھر کے انتظار کے بعد، پھر ساری فضا پر بہار چھا جاتی ہے۔ اور میری تیرہ سامانی بے تابانہ پکار اٹھتی ہے کہ

حیرتؔ کے غمکدہ میں خوشی کا گزر کہاں! تم آ گئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

خدا آپ کے جذبۂ رہ نوردی کو تیز سے تیز تر کر دے، کہ اسی سے آپ کا یہ کاروانِ شوق، بایں ہمہ جذب وکیف، قرآنی منزل کی طرف جادہ پیما ہے۔

مپرس از کاروانِ جلوہ مستاں زاسبابِ جہاں برکندہ دستاں

بجانِ شاں، زآوازِ جرس شور چو از موجِ نسیمے درنیستاں

برادرانِ گرامی قدر!

مبداءِ فیض کی کرم گستری سے، قرآنی فکر کی اس حقیر کوشش کو جس قدر کامیابی ہوئی ہے، میں جب اس پر نگاہ ڈالتا ہوں تو میرا سرِ نیاز بدرگاہِ رب العزت، قدم قدم پر سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ تعداد کے اعتبار سے مٹھی بھر انسانوں کی یہ جماعت، ساز وسامان کے لحاظ سے بالکل بے بضاعت، نہ کسی دنیاوی سہارے کی کوئی تائید نہ کسی گوشے سے کسی قسم کی کوئی امداد۔ ایسے نامساعد

حالات اوران میں کامیابی کا یہ عالم ہے کہ ملک کو کوئی بعید سے بعید تر گوشہ بھی ایسا نہ ہوگا جو اس آواز سے متعارف نہ ہو۔

تحریک کی مقبولیت:

قوم کے تعلیم یافتہ ہوشمند طبقہ (INTELLIGENTSIA) میں، کسی نہ کسی نوعیت سے، اب قرآن کا چرچا ہو رہا ہے۔ نوجوان طالب علموں کا حلقہ اس آواز سے متاثر ہو رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ تک کے علمی گوشوں میں یہ آواز پہنچ چکی ہے اور وہاں کے ریسرچ اسکالرز، اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے اکثر آتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں ایک جرمن مصنف نے، اپنی سیاحتِ ہندو پاکستان سے متعلق ایک دلچسپ کیا شائع کی ہے جس کے ایک باب میں، اس قرآنی تحریک کے متعلق اپنے انداز میں تفصیل سے لکھا ہے--وہ مجھ سے ملنے آیا تھا-- اس محیر العقول کامیابی کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ حق کی آواز میں خود اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ ساز و یراق کی کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیتا ہے اور جو جماعت اس آواز کو لے کر آگے بڑھتی ہے، خدا کی کائناتی قوتیں آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ اور دنیا اس نظارہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے کہ

شعاعِ مہر خود بے تاب ہے جذبِ تمنا سے　　　حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

مجھے علی وجہ البصیرت اس کا یقین ہو رہا ہے خ، اور اس سے یہ امید ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر میرے سامنے آ رہی ہے کہ

شبنم افشانی میری پیدا کرے گی سوز و ساز　　　اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی!

مخالفت کا فائدہ:

حق کی آواز کی تائید کے سلسلہ میں بعض اوقات فطرت کا پروگرام عجیب ہوتا ہے۔ وہ حق کے موئیدین کے ذرائع کی کمی کو مخالفین کے زور مخالفت سے پورا کر دیتی ہے۔ ہماری قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں بالکل یہی ہوا ہے۔ ہمارے پاس اتنے وسائل کہاں تھے کہ ہم اتنی قلیل سی مدت میں اسے اس قدر عام کر سکتے۔ مخالفین کے بے پناہ پروپیگنڈہ نے یہ مقصد جس تیزی سے پورا کر دیا وہ ہمارے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔

گہے باشد کہ کارِ ناخدائی می کند طوفان!　　　کہ از طغیانِ موجے کشتیم بر ساحل افتاد است

سچ ہے۔ گرگٹ آتشِ نمرود کو بھڑکانے لئے پھونکیں مارتا ہے اور نتیجہ اُس کا گلزارِ ابراہیمیؑ کی نُزہت فشانیاں ہوتا ہے [1]۔ خدا اس کے پھیپھڑوں کی قوت کو اور زیادہ کرے۔

محتسب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے　　　رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام

مخالفت کی وجہ:

برادرانِ عزیز! کبھی آپ نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ طلوع اسلام کی اس قدر مخالفت کیوں ہوتی ہے؟ ہمارے ہاں کے

[1] ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو جلانے کے لئے آگ روشن کی گئی تو باقی جانور اسے بجھانے کی فکر کرتے تھے لیکن گرگٹ پھونکیں مار مار کر اسے بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ آگ ٹھنڈی ہو کر پھول بن گئی تھی۔ یہ اپنی مروجہ کہانیوں کی طرف تلمیح ہے جس میں روایات کی صحت و سقم سے بحث نہیں۔

مذہبی فرقے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ کیونکہ ہر فرقہ اپنا جتھہ قائم رکھنا اور اسے بڑھانا چاہتا ہے۔ طلوع اسلام کوئی مذہبی فرقہ نہیں۔ اس کی ساری تعلیم (قرآن کریم کی روشنی میں) فرقہ بندی اور گروہ سازی کے خلاف ہے۔ وہ وحدتِ امت کا داعی اور اخوتِ اسلامی -- بلکہ نوعِ انسان کی عالمگیر برادری -- کا نقیب ہے۔ جو لوگ اس کی پیش کردہ قرآنی فکر سے متفق ہیں، وہ نہ کسی نئے فرقے میں داخل ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی نوعیت سے باقی مسلمانوں سے الگ کوئی اپنا گروہ بناتے ہیں۔ وہ اسلامی ارکان (نماز روزہ وغیرہ) اسی طریق سے ادا کرتے رہتے ہیں جس طریق سے وہ ادا کرتے چلے آتے تھے۔ (میں خود حنفی گھرانے میں پیدا ہوا تھا اس لئے حنفی طریقے کے مطابق نماز پڑھتا ہوں)۔ نہ ہی وہ ختم نبوت کے بعد کسی نئے ظہور کے قائل ہیں -- خواہ وہ نبوت کے نام سے ہو یا مسیحیت اور مجددیت کے نام سے -- نبوت اور ختم نبوت کے بعد، وابستگی صرف اسلامی نظام سے ہوسکتی ہے، افراد واشخاص سے نہیں۔ افراد میں سے نہ کسی کا قول کسی کے لئے سند ہوسکتا ہے، نہ کسی کا عمل کسی کے لئے حجت۔ ظاہر ہے کہ جنکا عقیدہ اور مسلک یہ ہو، ان کے ہاں فرقہ بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا طلوع اسلام کی مخالفت، ایک مذہبی فرقہ کی حیثیت سے ہو ہی نہیں سکتی۔

مذہبی فرقوں سے آگے بڑھیئے تو سیاسی پارٹیوں کی آپس میں کشمکش رہتی ہے۔ کیونکہ ہر پارٹی کے سامنے اپنے اپنے سیاسی مفاد ہوتے ہیں۔ طلوع اسلام کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے بھی نہیں -- اس کے نزدیک مذہبی فرقوں کی طرح، سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی اُمت کی تخریب اور دین کی تباہی کا موجب ہے۔ ملتِ اسلامیہ، غیر مسلموں کے مقابلہ میں خود ایک پارٹی ہے۔ اس کے اندر پارٹیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے سیاسی رقابت کی بنا پر بھی طلوع اسلام کی مخالفت نہیں ہوسکتی۔

اس سے واضح ہے کہ طلوع اسلام کی مخالفت اس لئے نہیں ہوتی کہ ان حضرات کو ڈر ہے کہ یہ کسی دن طاقتور فرقہ یا پارٹی بن جائے گا۔ اس کی مخالفت، درحقیقت اُس قرآنی آواز کی مخالفت ہے جسے یہ بلند کرتا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں فَاِنَّھُمۡ لَا یُکَذِّبُوۡنَکَ وَلٰکِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجۡحَدُوۡنَ (6:33) یہ تیری مخالفت نہیں کرتے۔ یہ مخالفت کرتے ہیں قوانینِ خداوندی کی جن کا یہ انکار کرتے ہیں -- ذرا سوچئے کہ ملک میں لاکھوں کی تعداد میں ایسا لٹریچر شائع ہو رہا ہے جو نہ صرف دین کی اصل و بنیاد کے خلاف ہے بلکہ وہ قوم کے اخلاق تک کو تباہ کرتا ہے۔ ان حضرات نے کبھی متحدہ محاذ بنا کر یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اس لٹریچر کو ضبط کرلیا جائے۔ قوم میں ہزارہا افراد ایسے ہیں جو خدا۔ رسول۔ وحی۔ آخرت کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ ان کا (معاذ اللہ) مذاق اڑاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے دہریہ (ATHEIST) ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ ان حضرات کی طرف سے نہ ان کے خلاف کبھی کفر کے فتوے شائع ہوئے ہیں، نہ ان کی بیویوں پر طلاق پڑتی ہے، نہ ان کے نماز جنازہ پڑھنے پر کوئی اعتراض کیا جاتا ہے، نہ انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے سے روکا جاتا ہے۔ لیکن حامیانِ دین مبین کی رگِ حمیت پھڑکتی ہے تو ان لوگوں کے خلاف جو خدا، رسول، کتاب، ملائکہ، آخرت پر خالصۃً اس طرح

(1) احتشام الحق تھانوی صاحب

ایمان رکھتے ہیں جس طرح قرآن کا مطالبہ ہے۔ جو اس کی کوشش کرتے ہیں کہ خدا کی کتاب کا نور، اقصائے عالم میں پھیل جائے۔ جن کی سعی و کاوش کا منتہیٰ یہ ہے کہ مسلمانوں میں پھر سے وہ صحیح اسلامی نظام قائم ہو جائے جو آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے حجاز کی سرزمین میں، محمد ﷺ رسول اللہ والذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے متشکل ہوا تھا۔ اور جس کے قیام میں انسانیت کی فوز و فلاح کا راز پنہاں ہے۔ ان لوگوں کے خلاف شرق سے غرب تک متحدہ محاذ قائم کیا جاتا ہے، اور مخالفت کا طوفان برپا کر دیا جاتا ہے۔ ان کی بارگاہِ تقدس مآب سے فیصلہ صادر ہوتا ہے [1] کہ

> یہ لوگ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ ان کے عقدِ نکاح میں کوئی مسلمان عورت نہیں رہ سکتی۔ اور نہ کسی مسلمان عورت کا ان سے نکاح ہو سکتا ہے۔ نہ ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ نہ مسلمانوں کے قبرستانوں میں ان کا دفن کیا جانا جائز ہے [2]۔

قرآن کی انقلابی آواز:

حتیٰ کہ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یہ واجب القتل ہیں -- یہ سب کس جرم کی بنا پر؟ اس جرم کی بنا پر کہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ...... یہ کہتے ہیں کہ ہمارا آقا صرف اللہ ہے۔ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ...... ہم اسی کے احکام و قوانین کے سامنے جھکتے ہیں۔ کسی اور کے سامنے نہیں جھکتے۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے، یہ مخالفت ہماری نہیں، قرآن کی اس آواز کی ہے، جسے بلند کرنے کی ہم کوشش کرتے ہیں اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ

زخمہ برتارِ رگِ جاں می زند

وہ کسی انسان کا اقتدار و اختیار کسی دوسرے انسان پر رہنے نہیں دیتا۔ وہ کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کی کمائی پر عیش اُڑائے۔ وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا۔ خواہ وہ آسمانی حقوق کی مدعی ملوکیت ہو یا خدائی نیابت کی دعویدار پیشوائیت۔

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغامِ مرگ   دستگیر بندۂ بے ساز و برگ

بالفاظِ دیگر ___ موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے ___ لہٰذا، جو قوتیں دوسروں کو اپنا محکوم اور غلام رکھنا چاہیں، وہ قرآنی آواز کے عام ہونے کو کب گوارا کر سکتی ہیں۔ اندریں حالات، ان حضرات کی طرف سے اس فکر کی مخالفت قابلِ فہم ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں

---

[1] اُس زمانے میں پرویز صاحب کے خلاف ''ایک ہزار علماء'' کے دستخطوں سے کفر کا فتویٰ شائع ہوا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

[2] ایک ملنے والے نے جو کافی عرصہ کی سوچ بچار کے بعد طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کی طرف آئے ہیں، مجھ سے سوال کیا۔ وہ کہنے لگے کہ میں ایک عرصہ تک کمیونسٹ خیالات کا رہا کھلے بندوں مذہب کے خلاف جو جی میں آتا کہتا تھا۔ اس وقت کسی نے بھی مجھے یہ نہیں کہا کہ تم کافر ہو۔ تمہاری بیوی تم پر حرام ہے۔ اب میں اسلام کا گرویدہ ہوں، اور مجھ پر یہ فتویٰ عاید کر دیا گیا ہے۔ تو میں پھر سے وہی کیوں نہ ہو جاؤں جو پہلے تھا تا کہ ان فتوؤں کی زد سے بچ کر مسلمان شمار ہونے لگوں؟ اس کا جواب یہی کافر گر حضرات دے سکیں گے۔ میں کیا عرض کر سکتا ہوں؟

گرفتم حضرتِ مُلا ترش روست نگاہش مغزر ا ر نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم مرا ازکعبہ می راند حق اوست

قرآنِ کریم سے ان حضرات کی مخالفت (بلکہ معاذ اللہ نفرت) اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی شخص یونہی بلا ارادہ کہہ دے کہ ہمیں اس معاملہ میں قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، تو یہ تلملا اٹھتے ہیں اور شور مچا دیتے ہیں یہ پرویزیت ہے، اور وہ بیچارہ ہکا بکا رہ جاتا ہے کہ مجھ سے کی قصور سرزد ہو گیا۔ یعنی اب یہ حضرات قرآنِ کریم کا نام تک سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ کتنی گہری نفسیاتی حقیقت تھی جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (17:41) ہم اس قرآن میں، حقائق کے مختلف گوشوں کو لوٹا لوٹا کر لاتے ہیں، تا کہ یہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔ لیکن اس سے ان کی نفرت اور زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ خدا ہماری حالت پر رحم کرے۔

ان کی ذہنی سطح:

ان میں ایک طبقہ تو ان کا ہے جو دیدہ دانستہ قرآنی تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان سے ان کی مفاد پرستیوں پر سخت زد پڑتی ہے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جن کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں کہ وہ قرآنی حقائق کا ادراک کر سکیں۔ اس لئے ان کے نزدیک، صرف وہی شخص صحیح العقیدہ مسلمان ہو سکتا ہے جو ویسا ہی سوچے جیسا وہ سوچتے ہیں۔ وہی کہے جو وہ کہتے ہیں۔ جو ان کی ذہنی سطح سے ذرا بلند ہو کر قرآنِ کریم کے متعلق غور و فکر کرے، وہ کافر ہے۔ ان کے نزدیک قرآن کا مصرف اتنا ہی ہے -- کہ از یٰسین او آساں بمیری -- انہی کے متعلق حضرت علامہؒ نے کہا تھا کہ

زانسوئے گردوں دلش بیگانہ نزدِ اُو اُم الکتاب افسانہ
بے نصیب ازحکمت دینِ نبی آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق وہرزہ گرد ملت از قال واقولش فرد فرد
مکتب وملا و اسرار کتاب کور مادر زاد و نورِ آفتاب
(جاوید نامہ)

اقبالؒ کے متعلق ممکن ہے، کہہ دیا جائے کہ دین کے متعلق وہ کیا جانتا تھا کیونکہ وہ داڑھی منڈاتا تھا! یہ بات میں نے یونہی مزاحاً وقیاساً نہیں کہی۔ ان حضرات کے نزدیک خدا پرستی اور دین شناسی کا یہ اولیں معیار ہے۔ پچھلے دنوں میں نے مفتی محمد شفیع صاحب کے خط کے جواب میں لکھا تھا کہ

خدا پرستی کا معیار:

جس لٹریچر کی بنا پر مجھے کافر قرار دیا جا رہا ہے، اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس وقت ملک میں ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوان ایسے ہیں جو اس لٹریچر کی بدولت اسلام کے گرویدہ ہیں اور اگر یہ لٹریچر ان تک نہ پہنچتا تو وہ کبھی کے

مغربی مادیت یا رُوس کی کمیونزم کے آغوش میں جا چکے ہوتے۔

اس پر، ایک جریدہ میں، جو اس طبقہ کا نمایندہ ہے، لکھا گیا کہ:

> کیا جناب پرویزؔ از رہِ کرم ان ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے کسی ایک ایسے نوجوان کی بھی متعین طور پر نشاندہی کر سکتے ہیں (کہ وہ کون ہیں اور کس دنیا میں بستے ہیں) جو ان کا لٹریچر پڑھنے سے پہلے تو مادہ پرست اور ڈاڑھی منڈا ہو، مگر ان کا لٹریچر پڑھنے کے بعد خدا پرست بھی ہو گیا ہو اور داڑھی بھی رکھ لی ہو[1]۔
>
> (ایشیا، 26 مارچ 1962ء)

لہٰذا، ان کے نزدیک، دین کے معاملہ میں اقبالؒ کا قول بھی کیا وزن رکھ سکتا ہے؟ اس لئے اس امر کی وضاحت کے لئے کہ اس طبقہ کے علمِ دین کی حقیقت کیا ہے میں انہی میں سے دو ایک کی رائے پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ مفتی محمد عبدہ، مصر کے نامور عالم گزرے ہیں۔ یہ بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ وہ جامعہ ازہر کے متعلق، جو اسلامی دنیا میں مذہبی علوم کی سب سے بڑی درس گاہ ہے، لکھتے ہیں:

> جو شخص ازہر یا اس کی قبیل کے مدارس میں جتنی زیادہ مدت تک تحصیل علم کرتا ہے اتنی ہی اُس میں تحصیل علم کی صلاحیت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ (تفسیر المنار، جلد اوّل، صفحہ: 181)

مفتی محمد عبدہؒ کے شاگرد، سید رشید رضا (مرحوم) اپنے استاد کا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

> ان کا خیال تھا کہ علمائے ازہر اور ان کی قسم کے اور بڑے بڑے شیوخ وعلماء وہ بزرگ ہیں جن کی اصلاح کی امید باقی نہیں رہی۔

جب جامعہ ازہر کا یہ حال ہے، تو اُسی کے خطوط پر متشکل، ہمارے ہاں کے دارالعلوموں کے متعلق بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) طبقہ علماء کے سرخیل اور امام الہند سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی مشہور تصنیف، تذکرہ میں علماء کی سیرت وکردار کا جو نقشہ کھینچا ہے میں اس سے درگزر کرتا ہوں۔ ان کے علم کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

> مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ اُمتِ اسلامیہ کے تمام مفاسد ومصائب کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہئے۔ سارے برگ وبار وثمراتِ فساد کا انہی سے ظہور ونمود ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم باسم اصل واساسِ علوم شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، اگر کسی صاحبِ حکمت کی نظرِ کیمیائی ان کی تحلیل وتفرید کرے تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ اُن کا شریعتِ اصلیہ اور دین الخاص سے مرکز ہے اور کس قدر اس فتنہ عالم آشوب، یونانیت اور عجمیت سے

---

[1] یہ اخبار اس جماعت (جماعت اسلامی) کا ترجمان ہے جو اپنے آپ کو ماڈرن اور لبرل خیالات رکھنے والی کہتی ہے واضح رہے کہ اس وقت میرا مقصد ڈاڑھی کے متعلق کوئی بحث چھیڑنا نہیں۔ نہ ہی ڈاڑھی رکھنے والوں کا کسی طرح استخفاف مقصود ہے۔ میرا مطلب صرف یہ بیان کرنا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک خدا پرستی کا معیار یہ رہ گیا ہے

کوئی شے اس سے نہ بچی حتیٰ کہ علما علومِ الٰہیہ و بلاغت و بیان اور عملاً جزئیات اعمال و رسوم وہیئاتِ معاشرت وغیر ذالک۔ جب یہ حال علوم شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے، تو پھر ان اساطیر واوہام کا کیا پوچھنا جن کو بہ لقبِ شریف ''معقولات'' پکارا جاتا ہے۔

گزرے ہوئے لوگوں سے آگے بڑھیے تو جو لوگ آج اس طبقہ میں موجود ہیں، وہ بھی اس تنقید میں اِن سے پیچھے نہیں۔ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، طبقہءعلماء کے متعلق لکھتے ہیں۔

یہ طبقہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پا کر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ تمام دلچسپیاں سمٹ کر چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہوگئی ہیں۔ یہ لوگ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں۔ ان پر اظہار نفرت تو ان سے جتنا جی چاہے کرا لیجئے لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لئے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریروں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔

(تنقیحات صفحہ ۲۸)

آپ کو غالباً اس کا علم ہوگا کہ جس درس نظامیہ کی تکمیل کے بعد ان حضرات کو ''عالم'' ہونے کی سند ملتی ہے، قرآن کریم اس کے نصاب ہی میں داخل نہیں۔ صرف آخری سال، سورہ بقرہ (کی تفسیر بیضاوی) تبرکاً پڑھا دی جاتی ہے۔ لہٰذا، اس طبقہ کی طرف سے اگر قرآنی حقائق کی مخالفت ہوتی ہے تو یہ بچارے معذور ہیں۔ قرآنی حقائق کا ادراک ان کے بس کی بات نہیں۔

زخود رمیدہ چہ داند نوائے من زکجاست　　جہان اودگر است وجہانِ من دگراست

ان کا قصور وہ ہے جس کی طرف حضرت علامہؒ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ

تیری نگاہ فرومایہ۔ ہاتھ ہے کوتاہ　　ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ

مخالفت بر بنائے جہالت:

جو بات ان کی ذہنی دسترس سے باہر ہو وہ ان کے نزدیک کفر ہے۔ اور اس ''کفر'' کی مخالفت جہادِ عظیم ـــ! اگر انہیں کہیں ایسی تعلیم مل جائے جس سے یہ قرآن کریم کا پیش کردہ تصورِ حیات اور اس کے حقائق وغوامض سمجھنے کے قابل ہو جائیں، تو پوچھئے نہیں کہ ان کی حالت کیا سے کیا ہو جائے۔

زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں
کیا جانیئے کیا کہتا ـــ کیا دیکھتا ـــ کیا کرتا!

جب قرآن کریم سمجھ میں آنے لگ جائے تو پھر انسان کا دامنِ نگاہ، چھوٹی چھوٹی جزئیات اور فرعی اختلاف میں الجھتا ہی نہیں۔ اس کی نظر بہت بلند اور اس کی فکر کا دائرہ بڑا وسیع ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہ دین کے مہماتِ اصول اور زندگی کے اہم عملی مسائل پر ہوتی ہے۔ وہ ہر اس شخص کو اپنے سے قریب تر لانے کی کوشش کرتا ہے، جس کا رجحان ذرا سا بھی دین کی طرف ہو۔ اگر ان حضرات کو توفیق نصیب ہو کہ یہ قرآن کے حقائق سے بہرہ یاب ہو سکیں تو یہ آپ احباب کو، سب سے زیادہ اپنے قریب پائیں۔ جس کی نگاہ قرآن پر ہو، اس کی تو کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جو قرآن سے قریب ہو وہ اس کا عزیز ترین دوست اور رشتہ دار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے میں ان حضرات سے کہا کرتا ہوں کہ

اک نظر تم میرا محبوبِ نظر تو دیکھو
وہ تو وہ ہیں تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے!

لیکن مشکل یہ ہے کہ انہیں تعلیم ہی کچھ اس انداز کی ملتی ہے جس سے یہ خدا کی کتابِ عظیم کی طرف آنے ہی نہیں پاتے۔ اور چونکہ انہیں بتایا یہ جاتا ہے کہ جو کچھ اس کے مطابق نہ ہو جو تمہیں پڑھایا گیا ہے، وہ کفر اور باطل ہے، اس لئے یہ حضرات قرآن، اور قرآن پیش کرنے والوں کی اس طرح مخالفت کرتے ہیں۔

یہ ہے مخالفت کرنے والوں کا وہ گروہ جو بر بنائے جہالت قرآنی فکر کی مخالفت کرتا ہے۔ انہی کو وہ شاطر اپنا آلہء کار بنا لیتے ہیں جو اپنے مفاد کی خاطر قرآنی فکر و نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔

لیکن یہ آواز دب نہیں سکتی:

لیکن اللہ کا شکر ہے کہ قرآن کی یہ آواز اب اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اس کا سیلِ رواں، مخالفت کی اس خس وخاشاک سے رُک نہیں سکتا۔

تمام شہر ہے، دو چار دس کی بات نہیں
رہیں نہ رند۔ یہ زاہد کے بس کی بات نہیں

جن سروں میں خدا کی اِس کتابِ عظیم کا سودا سما جائے، ان کی زبانیں اس کے تذکرہ سے رُک کیسے سکتی ہیں؟ ان کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

اس کے بعد آئے، جو عذاب آئے
آئے کچھ ابر۔ کچھ شراب آئے

دستِ ساقی میں آفتاب آئے
بامِ مینا سے ماہتاب اُترے

سامنے پھر وہ بے نقاب آئے!
ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو

اور اس طرح ''زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے''۔ دنیا انہیں جو جی میں آئے کہے، ان کی انتہائی آرزو یہ ہے کہ یہ بحضور داورِ محشر جائیں تو ان کا شمار اس گروہ میں نہ ہو جس کے متعلق حضور رسالت مآب ﷺ بدرگاہِ رب العزت شکایت کر رہے ہوں کہ

یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا ھٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَھۡجُوۡرًا (25:30)

اے میرے پروردگار! یہ ہے میرے نام لیواؤں کی وہ قوم جس نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا (یا اس کی آزادی سلب کر رکھی تھی)

آپ کو برادرانِ عزیز! اس حقیقت کا علم ہے کہ میں شروع سے یہ اعلان کرتا چلا آ رہا ہوں کہ میں قرآن کریم کا طالب علم ہوں۔ میں جو کچھ قرآن مجید سے سمجھتا ہوں اسے بلا کم وکاست دوسروں کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ حرفِ آخر ہے یا اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں۔

معیار قرآن ہونا چاہیئے:

میرے اس اعلان پر میری تصانیف شاہد ہیں۔ میں ہمیشہ اربابِ نظر کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ میری قرآنی فکر کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں اور اگر انہیں کسی جگہ کوئی سہو یا سقم نظر آئے تو اس سے مجھے مطلع فرمائیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔لیکن اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ صحیح اور غلط کا معیار قرآن کریم ہو۔ میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآن پیش کرتا ہوں، اس لئے اسے قرآن ہی کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔اگر میری کوئی بات قرآن کے خلاف ہے، اور کوئی جاہل اور عامی بھی اس کی نشاندہی کرتا ہے، تو میں اس کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ ہوں۔لیکن اگر کوئی فرد یا افراد کی جماعت --خواہ وہ گروہِ کثیر ہی کیوں نہ ہو--- یہ کہتی ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ ہمارے معتقدات کے خلاف ہے، اس لئے غلط اور خلافِ دین ہے، تو میں اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ میں جس خدا پر ایمان لایا ہوں اس کا حکم یہ ہے کہ اِتَّبِعُوۡا مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَلَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ؕ (7:3) جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو۔ اس کو چھوڑ کر، اور سرپرستوں اور مددگاروں کی پیروی مت کرو۔ یہ ہے میرے نزدیک غلط اور صحیح۔حق و باطل اور کفر و ایمان کا معیار--

وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44)

جو کتاب خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتا تو یہی لوگ کافر ہیں۔

میرے لئے حرفِ آخر اور قولِ فیصل ہے۔ اگر کسی کے نزدیک یہ ''کفر'' ہے تو مجھے اس ''کفر'' پر ناز ہے۔ خدا اس پر مجھے زندہ رکھے اور اسی پر موت دے۔

۞۞۞۞۞

آپ کا کام:

اب برادرانِ عزیز! دوسری طرف آیئے۔ میں نے جو کہا ہے کہ فطرت، بعض اوقات، خود مخالفین کی مخالفت سے حق کی تائید کا کام لے لیتی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ احباب، قرآنی آواز کے پھیلانے کے سلسلہ میں اپنی سعی وکاوش میں سست رو ہو جائیں۔ قطعاً نہیں، یہ ٹھیک ہے کہ ٹھوکر (FALL) نہر کے پانی کی رفتار کو تیز کر دیتی ہے، لیکن اُسی نہر کی رفتار کو جس کا پانی ٹھوکر کو پھاند کر آگے بڑھ جائے۔ اگر نہر کے پانی کی سطح ٹھوکر کی بلندی سے نیچی ہو، تو وہ نہر جوہڑ بن جاتی ہے اور اس کی روانی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مخالفت کی تیزی کے ساتھ آپ کی کوششیں تیز سے تیز تر ہوتی جائیں۔

عملی پروگرام:

اس ضمن میں، عزیزانِ من! میں ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ میں جو حضرات کچھ عرصہ سے اس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ تو اس حقیقت کو سمجھ چکے ہیں لیکن نو وارد احباب جو ایک خاص ولولہ لے کر شریکِ محفل ہوتے ہیں، انہیں اس نکتہ کے سمجھنے میں ذرا دقت لگتا ہے۔ جو کچھ میں، اس مقام پر کہنا چاہتا ہوں اس کا اولین مخاطب یہی طبقہ ہے۔ ان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی عملی پروگرام نہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی متعدد بار عرض کر چکا ہوں، ہمارے ہاں ہنگامی تحریکوں اور سیاسی جماعتوں نے اس قسم کا تصور عام کر رکھا ہے کہ جس پروگرام میں ہنگامہ خیزیاں اور شوانگیزیاں نہ ہوں، وہ پرگرام عملی نہیں ہوتا۔ عملی پروگرام کے لئے، بگولوں کا سا رقص اور طوفان کا سا جوش وخروش ضروری ہے۔ طلوع اسلام اپنی نوعیت کی پہلی اور منفرد تحریک ہے جس کا مقصد لوگوں کے قلب ونگاہ میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اس لئے کہ اس نے قرآن کریم کی تعلیم سے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ؕ (13:11) جب تک کسی قوم میں نفسیاتی تبدیلی نہیں ہوتی اس کی حالت نہیں بدل سکتی۔ طلوع اسلام کا مقصد، قوم میں اس نفسیاتی تبدیلی کا پیدا کرنا ہے۔ اور یہ مقصد ہنگامہ آرائیوں سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ خاموش لیکن استقامت آمیز تبلیغ سے ہوسکتا ہے۔ لاہور کا تو مجھے علم نہیں، لیکن کراچی میں، برسوں تک ایک عجیب منظر دکھائی دیتا رہا۔ شام کے وقت، شہر کی سب سے بارونق سڑک الفنسٹن سٹریٹ کے چوراہے پر، ایک کونے میں، ایک یوروپین نوجوان خاموش کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ عمدہ سوٹ میں ملبوس، ایک تھیلہ گلے میں لٹکائے، اور ہاتھ میں ایک پمفلٹ لئے خاموش کھڑا ہے-- خاموش، پتھر کے بت کی طرح خاموش، دو دو تین تین گھنٹے ہر روز اسی طرح کھڑا رہتا۔ اگر کسی نے آگے بڑھ کر پمفلٹ مانگا تو اس نے زبان سے ایک لفظ کہے بغیر، ہاتھ والا پمفلٹ اسے دے دیا، اور ایک نیا پمفلٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میں نے اُسے ہفتوں، مہینوں، برسوں اسی طرح دیکھا۔

خاموش تبلیغ:

اس قسم کے اور نوجوان بھی، شہر کے مختلف مقامات پر اسی طرح کھڑے ملتے۔ یہ ایک عیسائی تبلیغی ادارہ کے مشنری تھے۔ لوگ ان کی اِس ''بے معنی'' حرکت کا مذاق اڑاتے، لیکن جب ان کی رپورٹ شائع ہوتی تو اس سے معلوم ہوتا کہ ان کی وہ خاموش تبلیغ کس

قدر گہرا اور وسیع اثر کرتی جارہی تھی۔ وہ دراصل اس طرح متجسس لوگوں کا رُخ اپنے مرکزی ادارہ کی طرف موڑ دیتے تھے۔

ہمارا پروگرام:

ہمارے سامنے بھی برادرانِ عزیز! اسی قسم کا پروگرام ہے۔ ہمارا مقصد قرآنی تعلیم کی تبلیغ ہے۔ یعنی اس فکر کو خود سمجھنا اور سمجھنے کے بعد دوسروں تک پہنچانا۔۔ لٹریچر کے ذریعے پہنچانا، اور معاملات میں اپنے حسنِ کردار کے ذریعے اس کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا۔ اس پروگرام کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ یہ ختم نہیں ہوسکتا۔ لیکن قرآنی پروگرام اور اُن خاموش مشنریوں کے پروگرام میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ خاموش کھڑے رہ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ یہ زندگی کا منفیانہ پہلو (NEGATIVE ASPECT) ہے، اور عیسائیت کی خصوصی تعلیم۔ قرآن، مثبت پہلو (POSITIVE ASPECT) کو سامنے لاتا ہے اور اسی کو صحیح قرار دیتا ہے۔ یہ وہ طریق ہے جو ملتِ اسلامیہ کے مؤسس حضرت ابراہیمؑ کو خدا کی طرف سے اس وقت ملا جب آپ نے، قوم کی حالت سے شدید طور پر متاثر ہوکر بدرگاہِ رب العزت عرض کیا کہ رَبِّ اَرِنِیۡ كَيۡفَ تُحۡىِ الۡمَوۡتٰى ؕ مجھے بتا کہ اس قسم کی بے حس اور مردہ قوم کس طریق سے زندہ ہوگی؟ وہ طریق کیا تھا؟ یہ کہ فَخُذۡ اَرۡبَعَةً مِّنَ الطَّيۡرِ فَصُرۡهُنَّ اِلَيۡكَ یعنی وہی طریق جس سے وحشی پرندوں کو سدھایا جاتا ہے۔ پرندوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ آپ کے سائے سے دور بھاگتے ہیں۔ ذرا سی آہٹ ہوئی اور جھٹ سے اُڑ گئے۔ ان پرندوں کو سدھانے کے لئے خاموش کھڑے رہنے سے کام نہیں چل سکتا۔ انہیں حسنِ سیرت سے اپنے ساتھ اس قدر مانوس کرنا پڑتا ہے کہ آپ انہیں کھلی فضا میں چھوڑ کر جہاں جی چاہے چلے جائیں۔ ثُمَّ ادۡعُهُنَّ يَاۡتِيۡنَكَ سَعۡيًا ؕ (2:260) آپ کی آواز پر وہ دوڑتے ہوئے آپ کی طرف آ جائیں گے۔ یہ مثبت پروگرام ہے۔ لیکن اس میں ہنگامہ آرائی کا کوئی دخل نہیں۔ دخل تو ایک طرف اگر انہیں سدھانے کے دوران میں کہیں ذرا سی آہٹ ہوجائے۔ یا آپ سے کوئی خلافِ معمول اور غیر مانوس خفیف سی حرکت سرزد ہوجائے تو فوراً بدک جائیں گے۔ لہٰذا اس کے لئے نہایت صبر و سکون کے ساتھ، ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق چلتے جانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے ندی کی سی روانی اور چٹان کی سی استقامت کی ضرورت ہوگی۔ یہی ہمارا پروگرام ہے اور اسی پر ہمیں کاربند رہنا ہے۔ اس تبلیغ کے ذرائع میں عندالضرورت، اور حسبِ اقتضائے وقت تبدیلی آتی رہے گی، لیکن کسی کی بے تابیٔ تمنا کا تقاضا کچھ اور ہی کیوں نہ ہو، ہمارے پروگرام میں ہنگامہ آرائی کا دخل کبھی نہیں ہوگا۔ جو احباب، اس پروگرام میں شریک ہونا چاہیں، انہیں اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہاں پروانے کی طرح جلنا ہے۔ مرغِ سحر کی طرح شور نہیں مچانا۔

ضدی لوگ:

اس سلسلہ میں ایک اور ضروری بات کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں ۔۔ اور ان کا تعلق بیشتر قدامت پرست مذہبی طبقہ سے ہوتا ہے ۔۔ کہ تعصب ضد اور ہٹ دھرمی جن کا شعار ہوتا ہے، اور انہوں نے پہلے ہی فیصلہ کر رکھا ہوتا ہے کہ ہم نے کسی کی سننی ہی نہیں ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہہ دیا ہے کہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (2:6) جولوگ پہلے ہی فیصلہ کئے بیٹھے ہوں کہ کچھ بھی ہو ہم نے کسی کی بات ماننی ہی نہیں۔ اُنہیں اُن کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، ان کے لئے یکساں ہے۔ وہ کبھی صداقت کی بات نہیں مانیں گے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ سے کہہ دیا گیا تھا کہ: وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (73:10) ان سے نہایت حسن کارانہ انداز سے کنارہ کشی اختیار کرلو۔ اس قسم کی جامد، متعصب، ضدی ذہنیتوں کے سامنے قرآنی فکر پیش کرنے میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہیں کرنی چاہئے۔ اگر ذرا دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو ایسے لوگوں کو پہچاننے میں چنداں دشواری نہیں ہوتی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

مئے من از تنک جاماں نگہ دار شراب پختہ از خامان نگہ دار
شرر از نیستانے دور تر بہ بہ خاصاں بخش و از عاماں نگہ دار

قرآنی فکر کو ان لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہئے جو زندگی کے عملی مسائل پر غور وفکر کرنے، اور علم وبصیرت کی رُو سے، انسانیت کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے متمنی اور آرزو مند ہوں۔ قرآن کا خطاب ہی اُن لوگوں سے ہے جن میں زندگی کی کچھ رمق اور حرارت ہے۔ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (36:70) یہی وہ زمین ہے جس میں اس فکر کا تخمِ صالح شجرِ طیب بن کر پھولتا پھلتا ہے اور انہی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ

نہیں ہے ناامید اقبالؒ اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ہمارے نادان دوست:

دوسری بات جس کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے، اس سے بھی اہم ہے۔ مثل مشہور ہے کہ نادان دوست سے دانا دشمن اچھا۔ دانا دشمن کس طرح اچھا ہوتا ہے، اس کے متعلق تو میں کہہ نہیں سکتا، لیکن نادان دوست کس قدر نقصان پہنچاتا ہے، اس کا تجربہ مجھے آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ ہمارے یہ ''نادان دوست'' ہماری تحریک سے وابستہ ہیں۔ بعض ان میں سے بزموں کے ممبر بھی ہیں۔ طلوع اسلام کا مدت سے مطالعہ کرتے ہیں۔ لٹریچر کا مطالعہ کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ لیکن حالت ان کی یہ ہے کہ وہ طلوع اسلام کی تحریک، اس کی پیش کردہ قرآنی فکر اور خود میرے متعلق ایسے ایسے عقاید ونظریات لوگوں سے بیان کرتے ہیں، جنہیں سن کر میں محوِ حیرت رہ جاتا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ

خدا مجھے میرے ان دوستوں سے بچائے:

میرا اندازہ ہے کہ آپ کی تحریک کو اتنا نقصان آپ کے مخالفین کے سب وشتم سے نہیں پہنچا جتنا ان متفقین کی نوازشہائے بیجا سے پہنچتا ہے۔ یہ حضرات تحریک کے لئے بڑے ہی خطرناک واقع ہوئے ہیں اور ان کی اس حرکت کی روک تھام نہایت ضروری ہے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ

(1) جب آپ سے کوئی شخص، تحریک، اس کے نظریات یا میرے عقاید ومسالک کے متعلق کچھ پوچھے تو یہ دیکھئے کہ

اس کا جواب ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کسی کتاب، رسالہ یا پمفلٹ میں ہے؟ اگر ہوتو دریافت کرنے والے سے کہیئے کہ میں فلاں تحریر آپ تک پہنچادوں گا۔اس میں آپ کواس کا جواب مل جائے گا۔

(2) اگر آپ کی دانست میں، اس کا جواب شائع شدہ لٹریچر میں نہ ہو،تو اس سے کہہ دیجئے کہ مجھے اس کے متعلق علم نہیں۔ادارہ کا پتہ یہ ہے۔آپ ان سے براہِ راست دریافت کرلیں۔

مختصراً یہ کہ آپ اپنی طرف سے اس قسم کے سوالوں کا جواب بالکل نہ دیجئے۔سند تحریر کی ہے۔اُس کے سامنے پیش کیجئے۔زبانی باتیں ''روایات'' کے تابع آجاتی ہیں۔''روایات''میں نہ الجھیے۔

میں مختلف بزموں کے نمایندہ حضرات سے درخواست کروں گا کہ وہ براہِ کرم، اپنے اراکین پر اس سلسلہ میں کڑی نگاہ رکھیں اوراگر کوئی رکن اس کی خلاف ورزی کرے تو اس سے مواخذہ کریں۔اگر کوئی رکن تنبیہ کے باوجود اس سے باز نہ آئے، تو سمجھ لیجئے کہ وہ آپ کے ساتھ شامل ہی آپ کی تحریک کو نقصان پہنچانے کے لئے ہوا ہے۔تحریک کو اس سے بچاتے رہئے۔

اس مقام پر میں یہ اعلان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ طلوع اسلام صرف ان باتوں کا ذمہ دار ہے جو اس نے اپنی تحریروں میں پیش کی ہیں۔ان کے علاوہ وہ کسی بات کا ذمہ دار نہیں، خواہ اُسے کوئی بھی اُس کی طرف منسوب کیوں نہ کرے۔

❁❁❁❁❁

ہماری عملی زندگی

اب میں، عزیزانِ من! اس خطاب کے سب سے اہم گوشے کی طرف آتا ہوں۔آپ، قرآنی تعلیم، لیکن قرآن کریم کا ولولہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔یہ بڑی مبارک بات ہے۔لیکن قرآن کریم کا سمجھ لینا مقصود بالذات نہیں۔اسے سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔اگر قرآن کریم کا صحیح مفہوم ہماری سیرت وکردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا، تو یہ ذہنی تفریح سے زیادہ کچھ نہیں۔اگر اس سے، ہمارے قلب کی گہرائیوں میں کوئی ایسا انقلاب پیدا نہیں ہوتا جس کی جھلک ہماری روزمرہ کی زندگی میں نہ پائی جائے، تو ایسی قرآن فہمی محض مشاعروں کی داد ہے-- جس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل   دل ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

دل ونگاہ کی اس مسلمانی کا مظاہرہ ہماری رفتار وگفتار وکردار، سب میں ہونا چاہئے۔اگر ہماری سیرت پاکیزہ، نگاہ بلند، کردار پختہ اور معاملات صاف نہیں، تو ہم میں اور ان لوگوں میں کیا فرق ہے جن کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ وہ قرآن کی تعلیم صحیح طور پر نہیں سمجھتے بجز اس کے کہ ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیں کہ ہم ان سے بہت آگے ہیں کیونکہ ہم قرانی تعلیم کو ان سے بہتر سمجھتے ہیں۔قرآن سمجھنے والوں کی زندگیاں ایسی ہونی چاہئیں جن سے وہ چلتے پھرتے دوسروں سے ممتاز ومتمیز نظر آئیں، اور جس کسی کو ان سے کبھی واسطہ پڑے، وہ ان کے حسنِ معاملہ سے متاثر ہوکر، بے ساختہ پکار اٹھے کہ-- دیدہ ام مردے درایں قحط الرجال-- اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے پیش نظر، پورے کے پورے معاشرہ میں قرآنی انقلاب پیدا کرنا

ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب تک معاشرہ میں ایسا انقلاب نہ آ جائے، ہم اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ کریں۔ غلط معاشرہ کی بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں جن پر انفرادی طور پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے، لیکن زندگی کے جن دائروں میں ہم مجبور نہیں، وہاں کونسی چیز مانع ہوسکتی ہے کہ ہم اپنے اندر حسنِ سیرت پیدا نہ کریں؟ اپنی ہر کمزوری کے لئے معاشرہ کی مجبوری کو سپر بنا لینا، بہت بڑی خود فریبی میں مبتلا رکھیں۔ صداقت، اخوت، محبت، شفقت، حسنِ معاملہ، ایفائے عہد، کشادہ نگہی، وسعتِ ظرف، تحمل بردباری، پاکیزگیءِ خیالات، عفتِ قلب ونظر، یہ ہمارے امتیازی نشانات ہونے چاہئیں۔ میں نے ان چند خصوصیات کا ذکر محض مثال کے طور پر کیا ہے۔ مجملاً یوں سمجھئے کہ ہماری ساری زندگی سیرتِ محمدیہ ﷺ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہونی چاہئے، کہ قرآن فہمی کا فطری نتیجہ یہی ہے۔

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارا رہن سہن نہایت پُروقار اور سنجیدہ ہو اور ہم سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہو جو پایہءِ ثقاہت سے گری ہوئی ہو۔ آپ چلتے پھرتے شریف انسان دکھائی دیں، جو خود بھی امن وسلامتی میں رہیں اور دوسروں کے لئے بھی امن وسلامتی کے پیامبر اور آرزومند ہوں۔ آپ کے ہاتھ سے کسی پر ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ اس کے برعکس عدل اور احسان آپ کا شیوۂ زندگی ہو۔

پاکستان کا استحکام:

یہ بھی ضروری ہے کہ آپ سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس سے اس خطہءِ زمین کے استحکام میں ضعف آنے پائے۔ اس لئے کہ ہماری درخشندہ امیدیں اور تابناک آرزوئیں اسی خطہءِ زمین سے وابستہ ہیں۔ ہم جس جنتی معاشرہ کا قرآنی تصور عام کر رہے ہیں، اس کی عملی تشکیل اسی خطہ میں ہو سکے گی۔ عام لوگوں کے لئے یہ خطہءِ زمین محض ایک مملکت ہے لیکن ہماری لئے قرآنی زندگی بسر کرنے کا لاینفک ذریعہ، اور نوعِ انسان کو موجودہ جہنم سے نکالنے کا دروازہ۔ اس سے ہمارے نزدیک اس کی سالمیت کی اہمیت واضح ہے۔ ہمارے ایک طرف ہندو جیسے تنگ نظر دشمن کے مذموم عزائم ہیں جو اپنی کئی جگوں کی غلامی اور محکومی کا انتقام ہم سے لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف روسی کمیونزم کا بلائے بے درماں ہے کہ

اس سیلِ سبک سیر وزمیں گیر کے آگے   عقل ونظر وعلم وہنر ہیں خس وخاشاک

اشتعال انگیزی:

پھر خود ملک کے اندر ایسے عناصر موجود ہیں جو تحریکِ پاکستان کے سخت دشمن تھے اور جو اب مقدس نقابوں کی اوٹ میں، ملک میں تخریب وانتشار پیدا کر کے اپنی شکست پندار کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ طلوع اسلام کے خلاف ہنگامہ آرائی میں دیکھئے کتنا بڑا عنصر ان گروہوں کا ہے جن سے یہ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں نبرد آزما تھا، کیونکہ وہ اس تصور کی مخالفت کرتے اور اسے دین کے خلاف بتاتے تھے۔ ان کے سینے میں وہی پرانے زخم ہیں جو اب تک مندمل نہ ہو سکے۔ یہ لوگ آپ کو ہر طرح

سے اشتعال دلائیں گے۔ لیکن آپ نے ضبط کے دامن کو ہرگز ہاتھ سے نہ چھوڑنا-- یہ امر موجب ہزار مسرت واطمینان ہے کہ گزشتہ دنوں آپ کی تحریک کے خلاف جو ہنگامہ آرائی کی گئی اور آپ احباب کو بُری طرح اشتعال دلایا گیا اس میں کسی ایک جگہ بھی صبر وسکون کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا۔ میں آپ احباب کو اس پر دلی مبارکباد کا مستحق سمجھتا ہوں۔

فرقہ بندی اور پارٹی بازی:

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہماری دعوت، فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے خلاف مسلسل جہاد ہے کیونکہ امت میں تفرقہ-- خواہ وہ مذہب کے نام سے ہو یا سیاست کے-- دین کی یکسر نقیض ہے۔ دین وحدتِ انسانیت کا علمبردار ہے جس کی منزلِ اول وحدتِ امت ہے۔ اس لئے آپ سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہیں ہونی چاہیے جس میں فرقہ بندی اور گروہ سازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ چونکہ عملی سیاست میں حصہ لینا ہمارے پروگرام میں نہیں، اس لئے ہمیں سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارے سامنے تو بس ایک ہی پروگرام ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم کی تعلیم کو صحیح طور پر خود بھی سمجھیں اور اسے دوسروں تک بھی پہنچائیں اور اس کے مطابق اپنے اندر اور دیگر افرادِ امت کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتے جائیں جس سے ہمارا معاشرہ قرآنی خطوط پر متشکل ہو سکے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ

نہ از ساقی، نہ از پیمانہ گفتم ۔۔۔ حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم

محو وثبات کا قانون:

جو کچھ میں پیش کرتا ہوں، اس میں اگر سہواً کوئی ایسی بات آجاتی ہے جو قرآن کریم کے منشا کے مطابق نہیں تو زمانہ اسے خود بخود مٹا دے گا۔ جو کچھ قرآن کے مطابق ہے، وہ ہزار مخالفتوں کے باوجود، زندہ رہے گا اور آگے بڑھے گا۔ اس لئے کہ کائنات میں محو وثبات، خدا کے قانون کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ يَمۡحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثۡبِتُ ۖۚ وَعِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡكِتٰبِ (13:39) اس لئے اگر ہماری کوئی بات قرآن کے مطابق ہے اور ہمارا زمانہ اسے قبول نہیں کرتا تو آنے والا زمانہ اسے قبول کرے گا۔ اگر میری بات حق پر مبنی ہے تو مجھے یقین ہے کہ

روشِ دہر کا ہر نقش پکارے گا مجھے ۔۔۔ یہ نہ سمجھو کہ مجھی تک میرا افسانہ ہے

سپاس گزاری:

میں نے، برادرانِ عزیز! پچیس تیس برس اُدھر، اپنے سامنے جو قرآنی پروگرام رکھا تھا، میری انتہائی بے بضاعتی کے باوجود، اس کی ایک ایک کڑی، یوں پوری ہوتی گئی کہ جب میں اپنی قطع کردہ منزل پر نگہِ بازگشت ڈالتا ہوں تو خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ یہ کیسے طے ہوگئی۔ اس کے لئے میں، جہاں بدرگاہِ صمدیت م آب قدم قدم پر سجدۂ تشکر وامتنان ادا کرتا ہوں وہاں آپ مخلص احباب کی بے لوث رفاقت اور بے پناہ محبت کے لئے اپنے دل کی گہرائیوں سے سپاس گزار ہوں، کہ آپ کی رفاقت کے بغیر، یہ طول طویل اور دشوار گزار منزل کبھی طے نہ ہو سکتی۔ میں نے اب تک جو کچھ پیش کیا، وہ ملک کے اردو دان طبقہ تک محدود تھا۔

اب میں اس سلسلہ کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں اور نہ صرف اپنے ملک کے انگریزی خواں طبقہ تک ہی اس آواز کو پہنچانا چاہتا ہوں، بلکہ یورپ اور امریکہ کے ان مفکرین اور مدبرین کو بھی اس کے دائرے کے اندر لانا چاہتا ہوں جو قرآنی نظام و تصورات کو سمجھنے کے لئے ہمہ تن شوق نظر آتے ہیں۔ اور جن کے تقاضے اب اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ انہیں زیادہ عرصہ تک ٹالا نہیں جا سکتا۔ آپ احباب یہ سن کر خوش ہوں گے کہ اس سلسلہ میں بھی کام شروع ہو چکا ہے [1]۔ فالحمد للہ علی ذٰلك حمداً کثیراً۔

درسگاہ کا قیام:

اس کے بعد میرے پروگرام کی اہم (اور شاید آخری) کڑی ایک ایسی درس گاہ کا قیام ہے جس میں قوم کی نئی نسل کا قلب و دماغ صحیح قرآنی قالب میں ڈھل سکے اور ان کی صلاحیتیں پورے طور پر نشوونما پا کر، انسانیت کی فوز و فلاح کے کاموں میں صرف ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ پروگرام بڑا ہمت طلب اور وسیع ذرائع کا متقاضی ہے لیکن

سودا ست در سرم کہ بہ ساماں برابراست بے دست و پائیم کہ ہنوز از وفورِ عشق

میری ساری عمر، اور اس کے عزائم، اس ایک یقینِ محکم کے سہارے زندہ و پایندہ رہے ہیں کہ

مسلم ہستی! سینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیشِ نظر لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ دار

میرے سامنے جب بھی کوئی نیا پروگرام آیا، میرا انداز یہی رہا ہے کہ اس کے لئے جس قدر اسباب و ذرائع میسر آئے انہیں لیکر، میں اُس ربِ کریم کے آستانِ عالیہ پر جھولی پھیلا کر حاضر ہو گیا، اُس درخواست کے ساتھ جو حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کے سامنے پیش کی تھی کہ

جِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ط (12:88)

ہم یہ حقیر سی پونجی لے کر حاضر ہو گئے ہیں۔ ہمارے پاس یہی کچھ ہے۔ ہم اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں مانگتے۔ اسے قبول کر لیجئے اور ہمیں ہماری ضرورت کے مطابق غلہ دے دیجئے۔

اور میں نے دیکھا ہے کہ اس بارگاہِ عاجز نواز نے مجھے کبھی مایوس نہیں لوٹایا۔ لیکن اس سے بھی بڑی حوصلہ بخش تعلیم وہ ہے جو (نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے) ہمیں دی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ تمہارا کام اپنے فریضہ کی ادائیگی ہے یہ دیکھنا تمہارا کام نہیں کہ اس کے نتائج کب مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق ہوگا۔

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40)

اس لئے اس کی فکر کیوں ہو کہ ہمارے پیشِ نظر پروگرام کی تکمیل کب ہوگی۔ ہم سے تو کہا یہ گیا ہے کہ

دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے در طلب کوش و مدہ دامنِ امید زدست

ہمیں نتائج سے بے پرواہ، اپنی دھن میں آگے بڑھتے چلے جانا چاہئے۔ اگر ہمارا پروگرام قانونِ خداوندی کے مطابق

---

[1] انگریزی کے پمفلٹوں کے علاوہ، پہلی مستقل تصنیف Islam: A Challenge to Religion اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

ہے، ہمارے ارادے نیک اور ہمت میں استقامت ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ زود یا بدیر، اس کے خوشگوار نتائج مرتب نہ ہوں۔ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (12:56) اس خدا کا ارشاد ہے جس کا ہر وعدہ سچا ہوتا ہے۔ باقی رہیں قرآنی تصورِ حیات ونظام کی مخالفتیں، تو اس سے آپ قطعاً متاثر نہ ہوں۔ میری نگاہیں اُفقِ عالم پر ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اپنے غلط نظامہائے زندگی کا ستایا ہوا انسان، کس طرح ایک صحیح نظامِ زندگی کے لئے مضطرب وبیقرار ہے۔ خدا کا نظام زمان اور مقام میں محدود نہیں۔ اس کا خطاب سارے عالمِ انسانیت سے ہے۔ اس لئے کسی ایک مقام میں اس کی مخالفت، اس کے راستوں کو مسدود نہیں کر سکتی۔ زمانے کے تقاضوں کو کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ آپ قرآنی آواز کی مخالفت کرنے والوں سے کہہ دیجئے کہ

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں — چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (12:21)

۞۞۞۞۞

میں نے برادرانِ عزیز! سردست جو کچھ آپ سے کہنا تھا، کہہ چکا۔ میں ایک بار پھر، آپ احباب کی خدمت میں، اس حسین وسادہ اجتماع میں شرکت کے لئے ہدیہ سپاس گزاری پیش کرتا ہوا دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کے ارادوں میں برکت، دلوں میں اخلاص، بازوؤں میں ہمت اور پاؤں میں استقامت عطا فرمائے اور زندگی کے جس درخشندہ وتابناک مقصدِ جمیل وجلیل کو لے کر آپ اٹھے ہیں خدا کی کائناتی قوتوں کی تائید آپ کے شاملِ حال ہو، اور آپ تمام مواقع پر قابو پاتے ہوئے، اس راہ میں آگے بڑھتے چلے جائیں۔

یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش است

آپ یہاں آئے ہیں تو اس ولولہ کو لے کر کہ

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دیں — چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دیں

اور جب یہاں سے جائیں تو اس عزمِ بلند کو ساتھ لے کر کہ

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ خوں سے — تزئینِ در وبامِ حرم کرتے رہیں گے

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (3:8)

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (2:250)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

والسلام علیکم — پرویزؔ

۞۞۞۞۞

دوسرا اجلاس

کنونشن کا دوسرا اجلاس (جو ایک کھلا اجلاس تھا) چار بجے بعد دوپہر شروع ہوا۔ اس اجلاس میں مفکرِ قرآن کا اہم خطاب ــــ مثالی مملکت ــــ ایوان کے سامنے آ رہا تھا۔ اخبارات اور پوسٹروں کے ذریعے اس کی اہمیت منظرِ اشاعت پر آ چکی تھی۔ چنانچہ تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد جب پرویزؔ صاحب مائیک کی طرف بڑھے تو ایوان کنونیشن حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

پرویزؔ صاحب کا خطاب:

خطاب کا آغاز کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے، سب سے پہلے، مفکرین مغرب کی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ انسان کی سب سے بڑی ناکامی یہ ہے کہ وہ آج تک اپنے لئے ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جو انسانی ضرورتوں کی کماحقہ، بجا آوری میں کامیاب ثابت ہوا ہو۔ اس ناکامی کی وجہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے وضاحت کی کہ آج تک جو نظامِ حکومت بھی وضع کیا گیا اس میں اختیار و اقتدار کا سرچشمہ خود انسان تھے۔ حکومت کی شکلیں بدلتی رہیں لیکن یہی روح تھی جو ہر پیکر میں کارفرما رہی۔ پرویز صاحب نے مذہبی پیشوائیت کی خون آشام ڈکٹیٹرشپ سے لے کر کمیونزم کے استبدادی ہتھکنڈوں تک ہر نظام کا تجزیہ کیا اور تفصیلاً بتایا کہ صدیوں کے ان تجربات کے نتائج ہمیشہ جانکاہ مشقتوں اور جگر پاش مصیبتوں کی صورت میں سامنے آئے۔ انسانیت ان تجربوں میں خون کے دریا، آگ کی خندقیں پیرتی اور صدیوں سے تڑپتی، پھڑکتی، کٹتی، جھلستی اور ذبح ہوتی چلی آئی۔ ان نظامہائے زندگی کے زریں نقاب الٹنے اور انہیں تار تار کرنے کے بعد پرؔویز صاحب اس دینِ خداوندی کی طرف آئے جو خدا اور صرف خدا کو اقتدار و اختیار کا سرچشمہ (بلاشرکت غیرے) قرار دیتا ہے (اور تو اور) اپنے کسی نبی تک کو بھی یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ انسانوں پر اپنی حکومت چلائے۔

پرویزؔ صاحب نے مخصوص حسین انداز سے ''خدا کی حکومت'' کا مفہوم واضح کیا اور بہ دلائل و براہین اور علی وجہ البصیرت اس حقیقتِ عظمیٰ کی نقاب کشائی کی کہ خدا کی حکومت سے مراد ان اصولی قوانین اور مستقل اقدار کی کارفرمائی ہے جو قیامت تک قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے۔ یہ نظام پوری اُمت کی باہمی مشاورت سے، متذکرہ اصولی قوانین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں اپنی جزئیات مرتب کرے گا اور اس طرح ہر دور کی ضرورتوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے اپنے ارتقائی مراحل طے کرتا جائے گا۔ یہ سب کچھ پیش کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے قرآن کے تصورِ مملکت کی تفاصیل پیش کیں [1]۔

۞۞۞۞۞

[1] یہ خطاب ''بہارِ نو'' میں شائع ہو چکا ہے۔

تیسرا اجلاس

طلوعِ اسلام کنونشن کا تیسرا اجلاس 13 اپریل کی شب ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوا۔ یہ نشست پرویزؔ صاحب کے درسِ قرآن کے لئے مخصوص تھی۔ ''اولیاءاللہ کون ہیں؟'' ۔۔یہ تھا اس سلسلے میں ان کا موضوع خطاب، اوراس کے لئے

صلائے عام تھی یارانِ نکتہ داں کے لئے

چنانچہ موضوع کی علمی اہمیت کے پیشِ نظر اہلِ علم طبقہ کنونشن ہاؤس میں کھچا چلا آیا۔ رات کا وقت، رسل ورسائل کی نایابی، دور دراز فاصلہ، کوئی رکاوٹ بھی تو اہلِ شوق کی راہ میں حائل نہ ہوئی۔

پرویزؔ صاحب کا درسِ قرآن:

تلاوتِ کلام پاک کے بعد کیف ومستی کے وجد آفریں ماحول میں پرویزؔ صاحب کے درسِ قرآن کا آغاز ہوا۔ انہوں نے سب سے پہلے اس سوال کی اہمیت واضح کی کہ۔۔ ''اولیاءاللہ کون ہیں؟'' اور پھر بتایا کہ ہمارے ہاں یہ تصور چلا آرہا ہے کہ یہ ایک الگ گروہ ہے۔ ان کی خصوصیات بھی جماعت مومنین سے الگ قسم کی ہوتی ہے۔۔ زندگی میں بھی اور وفات کے بعد بھی۔ اس تصور کی حقیقت کیا ہے؟ اس سلسلے میں اگر تحقیق سے کام لیجئے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ تصور اسلامی ہے نہیں بلکہ باہر سے آیا ہے۔ اس کے اجزاء میں کوئی عنصر یہودیوں کا، کوئی مجوسیوں کا، کوئی یونانیوں کا اور (بالخصوص) کوئی ہندی ویدانت کا نظر آئے گا۔ پرویزؔ صاحب نے پھر یہ ساری تفصیل اس ایک شعر میں سمٹا دی کہ

آنکھ نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری
ان کی تصویر میں، پوچھے کوئی ان کا کیا ہے

اس کے بعد پرویزؔ صاحب نے الولی کا قرآنی مفہوم پیش کیا اور پھر واضح کیا کہ قرآن کی رُو سے خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے، خدا نے پہلے کائنات کی تخلیق کی اور پھر، اختیار وارادہ کی صفات عالیہ سے سرفراز کرکے، انسان کو پیدا کیا اور یہ انسان کی ندرت کاریاں ہیں جن کے باعث وہ حسن کائنات کی تکمیل میں خدا کا رفیق بن جاتا ہے۔ لاریب کہ اس رابطہ میں انسان کی حیثیت رفیقِ ادنیٰ کی ہوتی ہے۔ اور خدا کی حیثیت رفیقِ اعلی کی۔ پرویزؔ صاحب نے قرآن کی مختلف آیات پیش کیں اور ان کی روشنی میں بتایا کہ ولی کا لفظ خدا نے اپنے لئے بھی استعمال کیا ہے اور مومنین کے لئے بھی خدا، ولی، بمعنی حاکم اور سرپرست کے ہوتا ہے اور انسان ولی ہوتا ہے رفیقِ ادنیٰ کے معنوں میں۔ جب خدا اپنے حق حکومت میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا اور اسے گوارا نہیں کرتا کہ اس کے سوا کسی دوسرے کو بھی ولی تسلیم کیا جائے تو اس کا مطلب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے واضح کیا کہ کوئی انسان جب دوسروں کو ولی تسلیم کرتا ہے تو (بالفاظ دگر) وہ اسے خدا کے حق حکومت میں شریک کر لیتا ہے۔ خدا کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت جائز نہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کی اطاعت میں خدا کی اطاعت سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کا خوف ہر وقت ذہن پر مستولی رہتا ہے۔ وہ اسے ہر لمحہ حاضر و ناظر اور

عالم الغیب سمجھتا ہے۔اس کے سامنے لرزنے لگ جاتا ہے اور معافیاں مانگتا ہے۔ یہ حیثیت وہ خدا کو بھی نہیں دیتا۔

پرویز صاحب نے ''خدا کی اطاعت'' کا مفہوم واضح کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اطاعت اب صرف کتاب اللہ کی رُو سے ہوگی لیکن اس دنیا میں، خدا کی کتاب کے خلاف بھی ان حضرات کی اطاعت ضروری ہوجاتی ہے۔اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسمِ منزلہا

یہی نہیں، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر فخریہ طور پر کہا جاتا ہے کہ

ما زقرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

پرویزؒ صاحب نے اس حقیقت کی وضاحت کی کہ قرآن خدا سے انسان کا براہِ است اور بلا واسطہ تعلق پیدا کرنے آیا ہے۔ یہ تعلق خدا کی اسی آخری کتاب کی وساطت سے پیدا ہوتا ہے اور اگر خدا اور انسانوں کے درمیان کوئی اور واسطہ رکھنا مقصود ہوتا تو ختمِ نبوت کے اعلان کی کیا ضرورت تھی۔ یہ سب کچھ ٹھوس اور زندہ ءجاوید حقائق کی بنا پر ہوتا ہے۔لیکن تصوف میں حقائق کا گزر ہی نہیں بلکہ لطائف سے کام لیا جاتا ہے۔اس کی تمثیلات نری شاعری ہوتی ہیں جن کے پس پردہ کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

یہ تفصیل پیش کرتے ہوئے مفکرِ قرآن نے قرآنی آیات کی روشنی میں بتایا کہ ہر مومن خدا کا ولی ہوتا ہے اور اس میں کسی گروہ کی تخصیص نہیں۔ اولیاء اللہ کے بارے میں مروجہ عقاید اور تصورات ایک قوم کے زوال اور شکست کے دور کی نشانیاں ہیں۔ یہ اس دور کی باتیں ہیں جب قوم پر مایوسیاں چھا جاتی ہیں۔ جب قوائے عمل مضمحل ہوجاتے ہیں۔ جب نہ نظام باقی رہتا ہے جس کا سہارا پکڑا جا سکے اور نہ قوتِ عمل رہتی ہے جس سے زندگی کی راہوں کو ہموار کیا جائے۔ زندہ قومیں خود اپنی قوتِ عمل سے خدا کی تقدیر بنتی ہیں اور نت نئے معجزے دکھاتی ہیں۔

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

غرضیکہ انہوں نے اس خطاب میں ''طریقت اور معرفت'' کے متعلق مروجہ غلط تصورات کو قرآن کریم کی روشنی میں نہایت وضاحت سے پیش کیا[1]۔

❁❁❁❁❁

[1] یہ خطاب ''بہارِ نو'' میں شائع ہو چکا ہے۔

چھٹا اجلاس ——— (مجلسِ استفسارات)
(کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر)

چودہ اپریل کی شب کو اس یادگار مجلس کا انعقاد ہوا جو ہر سال ضابطہ کی پابندیوں سے آزاد ہو کر ایوان میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ کنوینشن کا ایوان، خمستانِ حجاز کا عکسِ جمیل قرار پا جاتا ہے اور بادہ نوشانِ حرم کی قطاریں ذوقِ تمنا کی ہزاروں بے تابیاں لئے پیر مغاں کے گرد پھیل جاتی ہیں۔ اور جب گردشِ جام وسبو کا مرحلہ آتا ہے تو ایوان کی وسعتوں میں ایک کیف سا برسنے لگ جاتا ہے۔ شہری ہنگاموں سے دور، گلبرگ کے اس دور دراز ویرانے میں نور ونکہت کا ایک سماں طاری تھا۔ جب ستاروں کی چشمکوں اور برقی قمقموں کی ضوفشانیوں میں پیر مغاں سوالات کا پلندہ ہاتھ میں لئے اپنی مسند پر رونق افروز ہوئے اور بادہ مستوں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

سوال وجواب کی یہ نشست ہمارا ایک منفرد سا اجلاس ہے۔ میں ایک مدت سے قرآن کا طالب چلا آ رہا ہوں اور کبھی اپنی کسی بات کو حرفِ آخر نہیں سمجھا۔ اب بھی میں اپنی علمی بصیرت کے مطابق آپ کے سوالات کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ اگر اس سے آپ کا اطمینان ہو گیا تو مجھے خوشی ہو گی۔ اور اگر اطمینان نہ ہو اور کوئی خلش باقی رہے تو اسے بعد ازاں باہمی گفتگو سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد مفکرِ قرآن نے ایک ایک سوال کو لیا اور باری باری پوری وضاحت سے اس کا جواب پیش کرنا شروع کر دیا۔ بڑے اہم سوالات سامنے آنے لگے اور پھر ان کے نکھرے نکھرے جوابات! قرآن کے عظیم طالب علم کے علم وبصیرت کی رفعتوں کو جانچنے کا اس سے بہتر شاید کوئی دوسرا مرحلہ نہ ہو۔

کیا قرآنی آیات جنتر منتر کا کام دے سکتی ہیں؟ جنت اور جہنم کی حقیقت کیا ہے؟ حیات بعد الممات کا قرآنی تصور کیا ہے؟ اپنی ارتقائی صفات کی بنا پر فکرِ انسانی غیر محدود شے ہے یا محدود؟ انسانی ذات کی نشوونما کا اصولی طریق، بروئے قرآن کیا ہے؟ نشوونما یافتہ ذات کی پہچان کیا ہے اور اس کے مدارج کیا ہیں؟ دینِ خداوندی کے معاملہ میں امت کا فریضہ کیا ہے؟ قطبین سے قریبی ممالک میں ماہِ رمضان کی سحری وافطاری اور پنج وقتہ نماز کے اوقات کا تعین کیسے ہوگا؟ ارکانِ اسلام کے بارے میں آپ کے کیا عقاید ہیں؟ قل العفو کے قرآنی حکم میں انفرادی ضرورت کی حد کیا ہے؟ انسانی اختیار وارادہ کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کی رُو سے تاریخ کی حیثیت کیا ہے اور اس کے واقعات کے صحیح یا غلط قرار پانے کی سند اور معیار کیا؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوالات سامنے آئے اور مفکرِ قرآن نے ان سب کے اس قدر واضح متعین اور دوٹوک جواب دیئے کہ ہر سائل عش عش کر اٹھا اور گیارہ بجے شب کے قریب جب یہ مجلس ختم ہوئی تو ہر شخص مفکر قرآن کی بصیرتِ قرآنی کا درخشندہ نقش دل میں لئے رخصت ہو رہا تھا۔ اپنی نشست سے اُٹھتے ہوئے ایک دیوانہ وفورِ شوق سے برملا کہہ رہا تھا۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز　　یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کیلئے

ساتواں (اور آخری) اجلاس

15 اپریل (اتوار) کی صبح کو کنونشن کا آخری اجلاس تھا۔ پرویزؔ صاحب اس اجلاس میں

اسلام کیا ہے؟

کے اہم موضوع پر خطاب کر رہے تھے۔ یہ اجلاس ایک کھلا اجلاس تھا اور اس میں داخلہ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک گھنٹہ قبل ہی حاضرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ متوقع حاضری کے پیشِ نظر اس اجلاس میں نشستوں کے وسیع تر انتظامات کئے گئے تھے لیکن جلد ہی اراکین استقبالیہ کے چہرے بتا رہے تھے کہ اہلِ شوق کی اس طوفانی آمد سے عہدہ برآ ہونا شاید ان کے بس کی بات نہ رہے۔ چنانچہ ایک مرحلہ پر نمائندگانِ کنونشن کو اپنی نشستیں خالی کرنی پڑیں اور ایوان کو اپنی تنگ دامانی کا اعتراف کرنا پڑا۔ طلوع اسلام کی تمام کنوینشنز میں اس قدر حاضری کی مثال موجود نہیں۔

ٹھیک نو بجے اجلاس شروع ہوا۔ صدارتی تقریر کے بعد پرویزؔ صاحب مسند خطاب پر رونق افروز ہوئے اور

پرویزؔ صاحب کا خطاب اسلام کیا ہے؟

کے موضوع پر ان کا تاریخی خطاب شروع ہوا۔ مفکرِ قرآن نے سب سے پہلے اُس جہانگیر نظام کی چند جھلکیاں پیش کیں جو کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں کارفرما ہے اور پھر بتایا کہ انسان جو اس خطہء ارض پر سلسلہء ارتقا کی آخری کڑی اور نظمِ کائنات کا حسین مقطع ہے، اس عالمگیر آئین سے مستثنیٰ قرار پا سکتا ہے؟ یہی اسلام اور دین اللہ ہے جو کائنات میں از خود کارفرما ہے لیکن انسان صاحب اختیار وارادہ ہونے کے باعث اس کی اطاعت پر مجبور نہیں بلکہ دل کی رضامندی سے بطیبِ خاطر اسے اختیار کرتا ہے۔ پھر انہوں نے سلسلہء نبوت کی وضاحت کی اور بتایا کہ یہ قوانین کس طرح منتخب ہستیوں کی وساطت سے جنہیں نبی اور رسول کہا جاتا ہے، انسانوں تک پہنچائے گئے اور واضح کر دیا گیا کہ ان کا اتباع تربیتِ ذات اور زندگی کی خوشگواریوں کا موجب ہوگا۔ اور ان کی خلاف ورزی تباہی و بربادی کا سامان ثابت ہوگی۔

اپنے خطاب میں پرویزؔ صاحب نے مومن اور کافر کے فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ مومن کی یہ زندگی بھی خوشگواریوں کی جنت ہوگی اور مستقبل بھی ہر قسم کا شادابیوں سے مالا مال۔ انہوں نے دنیا و آخرت کا مفہوم بھی قرآن کی روشنی میں واضح فرمایا اور بتایا کہ نبی اکرم ﷺ نے کس طرح اپنے بے مثال عمل سے اسلام کو ایک نظام معاشرہ کی صورت میں متشکل فرمایا اور اس کے درخشندہ نتائج اس کی صداقت کا زندہ جاوید ثبوت بنتے چلے گئے۔ یہ سب کچھ بیان کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے انسانوں کے اس خودساختہ مذہب کا ذکر کیا جو ملوکیت، سرمایہ داری، خانقاہیت اور پیشوائیت کا مرکب اور آج مسلمانوں کے ہاں رائج ہے۔

اپنا اہم خطاب ختم کرتے ہوئے مفکرِ قرآن نے فرمایا:

ایک وہ اسلام تھا جسے محمد ﷺ رسول اللہ والذین معہٗ نے پیش کیا تھا اور جس سے اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصے میں آ گئی تھی۔ اور ایک اسلام ہمارا آج کا ہے جس سے ہمارا شمار دنیا کی پست ترین قوموں میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ اسلام جس نے اس قوت ہمیں وہ سرفرازیاں عطا کی تھیں، آج بھی ہمارے پاس خدا کی زندہ و پائندہ کتاب میں محفوظ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسے ایک نظام کی شکل میں متشکل کرنے کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے؟

ان الفاظ سے ساتھ پرویزؔ صاحب کا اہم خطاب ختم ہوگیا[1]۔ پورا ایوان کیف و مستی کی بے خودی میں کھویا ہوا نظر آتا تھا۔ اسلام کی حقیقت اور عالم آرائی کے گہرے نقوش دل کی گہرائیوں میں مرتسم تھے اور زبانِ حال بے ساختہ پکار رہی تھی کہ اسلام کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ پاکستان کی ایک ممتاز شخصیت، جسے تحریکِ پاکستان میں نمایاں مقام حاصل رہا، وجد و مسرت سے جھومتی ہوئی آگے بڑھی اور وفورِ کیف میں یہ کہتے ہوئے مفکرِ قرآن سے بغلگیر ہوگئی۔

زندہ باد! آپ نے دلوں کو نئی روشنی عطا کر دی!

ہم بھٹکتے رہے اک عرصہ بیابانوں میں ۔۔۔ للہ الحمد کہ پہنچے ہیں گلستانوں میں

❁❁❁❁❁

الوداعی خطاب

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

کھلا اجلاس ختم ہوگیا۔ لیکن ہمصفیرانِ چمن کی الوداعی رسم کی ادائیگی ابھی باقی تھی۔ ٹھیک بارہ بجے اس تقریب کا آغاز ہوا جو یارانِ ہم سفر کی دلی حسرتوں کی آئینہ دار تھیں۔ سب اپنی اپنی نشستوں پر خاموش بیٹھے تھے اور پُر ملال نگاہیں سٹیج پر جمی ہوئی تھیں۔ اسی اسٹیج سے گزشتہ تین دنوں میں بار بار میر کارواں کی زندگی بخش آواز گونجتی اور نئی منزل کا سراغ دیتی رہی۔ لیکن اب کے بار جو وہ مائیک کے سامنے نمودار ہوئے تو ان کی افسردہ نگاہوں میں ایک افسانۂ غم جھلک رہا تھا۔ ضبط کے بند ٹوٹتے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک آہ بھری اور بمشکل اپنے آپ پر قابو رکھتے ہوئے ایک نازک فریضہ کی ادائیگی کے لئے لبوں کو جنبش دی۔ اُن کی آواز میں لرزشیں اُبھر رہی تھیں اور فضا تھرتھرا رہی تھی۔ جب انہوں نے آہستہ آہستہ یہ کہنا شروع کیا ـــــ

عزیزانِ من! جمعرات کی شام کو جب میں یہاں آیا تو حسین تمناؤں کی ایک بساط سی بچھائی جا رہی تھی۔ ایک سال بعد دل کی مرجھائی ہوئی کلیاں کھلکھلا اٹھیں اور نگاہوں میں سرور آ گیا۔ لیکن آج جب پہلے ہی کمرے میں قدم رکھا تو یہ بساط اٹھائی جا رہی تھی ـ ـ دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت، درد سے بھر آیا۔

---

[1] یہ خطاب اب پرویز صاحب کی کتاب ''اسلام کیا ہے'' کا حصہ بن گیا ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سوچتا ہوں کہ سال بھر کے طویل لمحے آپ کے انتظار میں کیونکر بسر ہوں گے۔

کسے خبر کہ نگارِ سحر کی حسرت میں　　　تمام رات چراغِ وفا پہ کیا گزری

''ہر سال یہ ہوتا چلا آ رہا ہے اور سال بسال یہ منظر کس قدر نا قابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی ترجمانی ممکن نہیں۔ آپ آئے تو کاشانہءِ ہستی میں رونق آ گئی۔ اب آپ جا رہے ہیں تو جو کچھ یہاں طے کیا ہے، اُسے یارانِ ہمسفر تک پہنچا دیجئے۔ یہی تحفہ ہے جو آپ ان کے لئے کنوینشن سے لیجا سکیں گے۔

''میں اس مٹھی بھر جماعت کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ کی بے سروسامانی میرے سامنے ہے۔ ایسے احباب بھی ہیں جو سال بھر اس سالانہ تقریب کا انتظار کرتے رہے لیکن پھر بھی نہ آ سکے کیونکہ ان کے پاس آنے کے لئے کرایہ نہیں تھا۔ ایسی بے سروسامان جماعت! اور عزم یہ لے کر اٹھی ہے کہ خدا کی کتاب اقوام عالم کی ضابطہءِ حیات قرار پا جائے۔

ذرہٗ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر!

''ایک بات ہمیشہ یاد رکھئے اور بھولئے نہیں کہ اگر مخالفتوں کے اس ہجوم میں، جو آپ کے گرد چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، آپ کی کوششوں میں کمی واقع ہوگئی تو یہ کرنیں جو فضا میں پھیل رہی ہیں ان پر جہالت اور توہم پرستیوں کے پردے پڑ جائیں گے۔ سوچئے کہ کتنی اہم ذمہ داری آپ کے سروں پر آ پڑی ہے۔

ہم اگر ہوش میں عدم آئیں　　　چشمِ ساقی کی بات جاتی ہے

''چشمِ ساقی کی بات'' رکھنے کے لئے جو کچھ لٹتا ہے لٹ جانے دیجئے۔ قرآن نے آپ سے بڑی امیدیں وابستہ کی ہیں اس کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ ساز و یراق کی کمی پر پریشان نہ ہوجئے۔ آگے بڑھتے جایئے اور یقین رکھئے کہ خدا کی امداد اس کی کائناتی قوتوں کے دوش پر سوار ہو کر آئے گی۔ میں آپ سے اور کیا کہوں!

ایک آنسو میں کہہ دیا غمِ دل
کس قدر میں نے اختصار کیا

آپ کی یاد آئندہ کنونشن تک میرے لئے سرمایہ حیات رہے گی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اب تنہا نہیں ہوں۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
چمن میں میرے راز داں اور بھی ہیں

خدا آپ کے عزائم کو وسعتیں عطا کرے اور بازوؤں کو قوتِ عمل سے بہرہ اندوز فرمائے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

۞۞۞۞۞

ڈاکٹر اعجاز رسول
erasool@aol.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن اور انسانی عقل

انسان ایک عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ مقصد سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس بات کو سمجھا جائے کہ انسان کن اشیاء کا مرکب ہے۔ انسان کے پاس بنیادی طور پر درج ذیل قوانین ہیں۔

1۔ انسان کا احساس شعور (Sense of Identity): یہ انسان کی زندگی کے دوران تبدیل نہیں ہوتا۔

2۔ انسانی جذبات: ان کی تعداد ایک اندازے کے مطابق تین ہزار سے اُوپر ہے۔ اس سے اوپر ہر جذبہ (Emotion) کا پیمانہ ہے۔ مثلاً ہم ناراض ہوتے ہیں تو یہ ناراضی تھوڑی سے لیکر بہت زیادہ ہوسکتی ہے۔ اس طرح ہمیں غصہ آتا ہے تو یہ بھی تھوڑی مقدار سے بہت بہت زیادہ ہوسکتا ہے۔ یعنی ہر جذبہ کا Scale ہے۔

3۔ ہم سوچتے ہیں: سادہ سوچ وہ ہے جس میں ہم زیادہ زور نہیں دیتے۔ جیسے ہم کسی کو ملتے ہیں اور علیک سلیک ہوتی ہے۔ عام لیول کی گفتگو ہوتی ہے۔

4۔ ہم سوچ کے متعلق سوچ سکتے ہیں: اسے عام طور پر Meta Cognition کہتے ہیں۔ یہ قابلیت ہمیں قوت فیصلہ دیتی ہے۔ اس قابلیت کی وجہ سے ہمارے اندر ہدایت نہیں رکھی جاسکی کیونکہ Free will اور Internal Guidance ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ یہ ایک عظیم قابلیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ ہمیں لاانتہا قوتوں کا مالک بنایا ہے اور اس کا استعمال اگر قرآنی فکر کے اندر رہ کر کیا جائے تو زندگی ایک نئی زندگی بن جاتی ہے۔ اس پر ہم بعد میں تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

5۔ ہماری یادداشت: یہ قابلیت انسانی سوچوں کے ساتھ بے پناہ قوتوں کی مالک ہے۔ ہم اپنی یادداشت میں اپنی کوشش سے علم کا اضافہ کرسکتے ہیں۔ ہم دوسروں کے کام سے سیکھ سکتے ہیں۔ بنیادی لیول سے یعنی نام یاد رکھنے سے لیکر انتہائی مشکل Mathematical concepts کو ہم یاد کرسکتے ہیں۔ اس سے ہم قرآنی فکر کو اپنے ذہن میں یاد کرکے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

6۔ انسانی جسم: اس میں اپنی ہیئت اور ڈیزائن کی وجہ سے بہت قوت رکھی گئی ہے۔ اس انسانی جسم کی بدولت ہم نے سائنس کے میدان میں علم حاصل کرکے قدرتی وسائل پر قابو پاکر بے شمار فائدے حاصل کرلیے ہیں۔ انسانی جسم کا علم ہم سائنس کی روشنی میں حاصل کررہے ہیں۔ اس کے اندر بھی بے شمار قوتیں کام کررہی ہوتی ہیں۔ لیکن اس کی سب سے بڑی

کمزوری اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں اور اس کی موت ہے۔ ان دو باتوں کا سمجھنا بہت ضروری ہے اگر ہم انسانی زندگی کی اہمیت سمجھنا چاہتے ہیں۔ اسی انسانی جسم کے استعمال سے ہم مزید ارتقائی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔ لیکن انسانی جسم کی ضروریاتِ زندگی صرف پورا کرنا ہماری عقل کا مقصد نہیں ہونا چاہیے۔

7۔ دوسرے انسان: انسانی زندگی اکیلے نہیں گزر سکتی ہے۔ اسے دوسرے انسانوں کی ضرورت ہے۔ انسان کے اندر ایسے جذبات ہیں جو کہ اسے دوسرے انسانوں سے تعلقات پر مائل کرتے ہیں۔ اگرچہ انسان اپنی قوت فیصلہ سے یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ وہ کس کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے۔

8۔ زمین: انسانی زندگی کے لیے زمین کے وسائل بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ جدید سائنس کی روشنی میں ہمیں علم ہے کہ زمین ہی وہ Planet ہے جس پر زندگی ممکن ہے۔ انسان ان وسائل سے اپنے اور دوسرے انسانوں کے فائدہ کے لیے کام کرسکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں انسان نے زمین کا ایک ایک کونا چھان مارا ہے اور مزید تحقیقات ہو رہی ہیں تاکہ زمین کے وسائل سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ زمین کو انسان نے مختلف ملکوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور باہمی مقابلے سے بے شمار نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے سبقت لی جاسکے۔

9۔ کائنات: زمین سے آگے کائنات ہے۔ جس کا علم انسان نے کچھ حد تک حاصل کیا ہے اور مزید حاصل کرنے کی کوشش جاری ہے۔ انسانی سوچ کی چونکہ کوئی متعین حد نہیں ہے اس لیے انسان جب تک زندہ رہتا ہے اپنی زندگی اور اردگرد کی کائنات کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔

10۔ قرآنی فکر: انسان اپنی سوچوں کا استعمال کر کے اپنی زندگی کے دوران بے شمار سوالات کا جواب ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اِن سوالات کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے اور دوسرے Planets اور Stars کے متعلق علم حاصل کرلیا ہے۔ اگرچہ انسان اپنی جسمانی کمزوری (Physical limitation) اور وسائل نہ ہونے کی وجہ سے دوسرے Planets پر نہیں جاسکتا لیکن اپنی عقل اور دماغی قوت کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کو اس کائنات کے ساتھ Relate کرسکتا ہے۔ پھر Telescopes وغیرہ کی وجہ سے وہ اس قابل ہوگیا ہے کہ اس اردگرد کی کائنات کے متعلق علم حاصل کر سکے۔ لیکن پھر بھی کچھ ایسے سوالات ہیں جن کا علم انسان کے پاس نہیں ہے مثلاً

(ا)۔ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔

(ب)۔ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی۔

(ج)۔ اس کائنات کا اختتام کیسے ہوتا ہے۔ اگرچہ عام انسانی زندگی تقریباً 80-102 سال ہے لیکن اس کی فکر لاکھوں سالوں کی رہتی ہے۔

(د)۔ اس کائنات کو کس نے بنایا ہے اور اگر کسی نے بنایا ہے تو اس کو ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

(ر)۔ زندگی ختم کیوں ہوجاتی ہے۔ خاص کر جو انسان صاحبِ قوت اور امیر ہیں اُن کا دل نہیں چاہتا کہ اُن کو موت آئے۔

(ز)۔ کیا موت کے بعد بھی زندگی ہے۔ اگر زندگی ہے تو اُس کی کیا شکل ہوگی اور کیا ہم اُس کو اپنی موجودہ سطح پر سمجھ سکتے ہیں۔ اگر سمجھ نہیں سکتے تو اُس سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(س) کیا God ہے تو کون سا نظریہ ایسا ہے جس سے انسان ذاتی طور پر فائدہ اٹھا سکے۔

اس طرح کے اور سوال ہیں جو کہ انسان کے دماغ میں آتے ہیں اور وہ ان کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔ اور اپنا وقت پورا کر کے موت سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ اس کو ہم ایک Equation کی صورت میں بھی لکھ دیتے ہیں۔

Human Life = Sense of Identity + Emotions + Thinking + Metacognition

+ (Human Memory) + (Human Body + other Human Beings)

+ (Earth + Universe) + the Quran (optional)

یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ انسانی زندگی میں انسان ہی مسائل پیدا کرتے ہیں اور انسان ہی مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔ چونکہ انسان مل جل کر رہتے ہیں۔ اس لئے آئین و اقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر انسان اپنی خوشی کو بڑھانا چاہتا اور اپنی مشکلات کو آسان کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ انسانی جسمانی زندگی کا انحصار زمینی وسائل پر ہے اس لئے جو انسان زیادہ طاقتور ہے وہ زیادہ وسائل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے انسان بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہوجاتے ہیں یہ طاقتور انسان انسانوں کے ہی ذریعہ دوسروں پر قابو رکھتے ہیں۔ انھی وجوہات کی بنا پر ہماری موجودہ زندگی میں مختلف قوموں نے جنم لیا ہے۔ ہر قوم کے اوپر ایک حکمران طبقہ ہے جو کہ دوسرے اپنے جیسے انسانوں کو اپنے کنٹرول میں رکھتا ہے۔ اس کے لیے نظام کوئی بھی ہو (سوائے قرآنی نظام کے) عام انسانوں کا تعلق حکمران طبقہ کے ساتھ حاکم اور محکوم کا ہوتا ہے۔ لیکن ان سب کی زندگی کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے کہ انسانی جسم کی ضروریات زندگی کو پورا کیا جائے اور اپنے لئے زیادہ سے زیادہ اکٹھا کرلیا جائے یعنی سرمایہ دارانہ نظام۔

ابھی ہم قرآنی فکر اور انسانی عقل کے باہمی تعلق کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ انسانی عقل اس سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

انسان جتنا بھی اس سوال کا جواب نہ چاہے یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کائنات اور انسان کی پیدائش کے پیچھے کوئی قوت کارفرما ہے جو کہ ایک قائدہ اور قانون کے مطابق کام کرتی ہے۔ اس قوت کے چند ایک اصول ہیں جو کہ مشاہدہ سے ہم سب کے علم میں ہیں۔

(1) کائنات جس کا ہم روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک قانون کے تحت کام کررہی ہے مثلاً Gravity اور Rotation۔

(2) انسانی زندگی کے مقابلہ میں اس کائنات کی عمر (Age) کہیں زیادہ ہے۔ اس سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ جسمانی عمر کے لیول پر ہماری اہمیت بہت کم ہے۔

(3) اگر ہم سوچیں تو یہ ساری کائنات بے مقصد ہے اگر ہم اور آپ اس کے متعلق نہ سوچ سکیں یہ ہماری سوچیں ہیں جو کہ اس کائنات کو کوئی Meaning دیتی ہیں اور اس سے کائنات ہمیں Meaning دیتی ہے۔

(4) اوپر سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگر ہم صرف جسم ہوں تو ہماری کائنات بے مقصد ہے۔ لیکن اگر میرے اندر ایک ذات ہے۔ یعنی میرے خیالات اور سوچیں تو یہ کائنات ایک ایسی حیثیت کے طور پر اُبھرتی ہے کہ جس سے یہ میری زندگی کو ایک مقصد عطا کرتی ہے۔ میں اس کائنات کے لیے نہیں ہوں۔ بلکہ یہ کائنات میرے لیے ہے۔ میں اس کو ایک Opportunity کے طور پر استعمال کر کے اس کی حدوں سے آگے جا سکتا ہوں۔

(5) یہ کائنات اور ہم ایک حقیقت ہیں جس کا مشاہدہ ہم روز کرتے ہیں۔ لیکن یہ قوتِ مشاہدہ بذاتِ خود ایک حقیقت ہے جس کو ہم اپنے ذہن کے لیول پر سمجھتے ہیں۔ ہمیں اپنی ذات کا احساس ہر وقت رہتا ہے (غالباً نیند کی حالت میں یہ احساس غالب آجاتا ہے)۔ ہمیں اپنی ذات اور اپنے وجود کا احساس رہتا ہے اور ہمیں علم ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں اور اپنی پسند اور ناپسند وغیرہ کے احساس سے ہمیں اپنی Personality ابھی علم رہتا ہے۔ یہ انسانی وجود ہمارے جسمانی وجود سے علیحدہ چیز ہے جو کہ اگرچہ نظر نہیں آتی لیکن اس کا احساس ہمیں اس کے وجود کے متعلق علم پہنچاتا ہے۔

(6) یہاں سے ہم ایک Step آگے چلتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی میں کئی کام کرتے ہیں مثلاً کھانا، لکھنا، گاڑی چلانا وغیرہ۔ یہ سب کام ہمارے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ہم کوئی کام نہیں کر سکتے اگر ہم اُس کے متعلق پہلے سے سوچتے نہیں ہیں۔ انسانی کاموں کے پیچھے کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اتنی بڑی کائنات کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا؟ اس مقصد کا پتہ چلانا ہمارا کام ہے۔ اس لیے کہ اگر میری زندگی کا کوئی مقصد ہے۔ تو اُس مقصد کو ڈھونڈنا بھی میرا مقصد ہونا چاہئے۔

(7) ہمارا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ ہم نے جو بھی قابلیت حاصل کی ہو مثلاً اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ ہنر، تجربہ وغیرہ ہم اپنے بچوں کو بذریعہ پیدائش نہیں دے سکتے۔ ہر بچے کو جسمانی طور پر ہماری شکل اور کچھ Genes وغیرہ تو مل جاتے ہیں لیکن Acquired Abilities نہیں مل سکتیں۔ یہ بھی قانون کا حصہ ہے۔

(8) اپنی زندگی گزارتے ہوئے ہم دوسروں کے ساتھ Interact کرتے ہیں۔ اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے اور دوسروں کا اثر ہم پر پڑتا ہے۔ ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ ہمارے رویہ اور الفاظ کا اثر بعض اوقات نتیجہ کافی دیر بعد پیدا کرتا ہے۔ مثلاً اگر کسی نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے تو میں اُس کو اُس وقت شاید کسی وجہ سے برداشت

کروں لیکن بعد میں اگر احساس قائم رہے تو میں اس کا بدلہ لے سکتا ہوں۔ اسی طرح بعض اوقات دوسروں کے اعمال کا دوہرا اثر ہوتا ہے مثلاً کسی نے اگر ہمیں دھکا دیا ہے تو اُس کے نتیجہ میں جسم کو بھی تکلیف ہوگی اور ساتھ ہی ذہنی اذیت بھی ہوگی۔

(9) ہمیں وقت کا احساس رہتا ہے۔ دن اور رات کے گزرنے کا احساس اور اپنی عمر کے گزرنے کا احساس ہمیں کام جلدی کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ساتھ ہی انسانی ضروریات کے لیے ہمیں زندگی میں کوشش کرنی پڑتی ہے۔

(10) ہم کس جگہ پیدا ہوئے ہیں اور کس گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے کنٹرول میں نہیں ہے۔ بچہ کو پیدائش کے وقت کسی چیز کا علم نہیں ہوتا کہ اُس کا رنگ، ذات، ماں باپ، مذہب، شکل، Gender وغیرہ کیا ہوں گی وہ صرف ان باتوں کا احساس کچھ سالوں بعد کرتا ہے۔ پیدائش کے وقت دوسرے بچوں کے برابر ہوتا ہے اور صرف اپنی ذات لیکر آتا ہے۔ باقی سب چیزیں اضافی ہوتی ہیں۔

ابھی ہم قرآن کی طرف آتے ہیں اور مختصراً دیکھتے ہیں کہ یہ ہمیں کیا دیتا ہے۔

(1) قرآن انسانی زندگی کا مقصد انسانی اعمال کے نتیجہ کو ظاہر کرنا بتاتا ہے اور قانونِ مکافاتِ عمل کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ (45:22) اس آیت میں کائنات کا مقصد بتایا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ چونکہ اعمال کا اثر ہماری ذات پر ہوتا ہے اس لئے ناانصافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(2) قرآن انسانی سوچ کی پیداوار نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ انسانی سوچ کے متعلق ہمیں حقیقت سے روشناس کرواتا ہے اور چونکہ ہم انسان قرآن کی طرح سوچ نہیں سکتے اس لیے قرآن ہمیں کہتا ہے کہ کوئی انسان ایسا سوچ کر لکھ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی انسان قرآن کا متبادل نہیں بنا سکتا اور نہ ہی کوئی قرآنی آیت بنا سکتا ہے۔

(3) چونکہ انسان قرآن کی طرح سوچ نہیں سکتا اور انسان کے اندر کوئی راہنمائی نہیں رکھی گئی اس لیے انسان کو قرآن بحیثیت رہنمائی کے اپنی سروس ایک Option کے طور پر آفر کرتا ہے۔ یہ انسان کی Free will کا استعمال ہے کہ وہ اس کی فکر کو استعمال کر کے اس آفر کو قبول کرے یا انکار کر دے۔

(4) قرآن کو ایک وحی کے طور پر قبول کرنے کے لیے عقل اور فکر کے استعمال کی اشد ضرورت ہے کیونکہ قرآنی فکر ہے ہی انسان کے ذہن کی رہنمائی کے لیے تاکہ انسانی فکر جن سوالات کے جوابات ڈھونڈتی ہے۔ قرآن اُن کے جوابات مہیا کرتا ہے ان جوابات کو پھر ہم اپنی زندگی کے تجربات اور Evidence پر پرکھ کر ان پر ایمان لاتے ہیں۔

(5) انسان کا ذہن چونکہ جذبات، خیالات اور یاداشت کا مرکب ہے۔ اس لیے انسان اپنی زندگی کے دوران مختلف شخصیات (Personality) سے گزرتا ہے۔ یہاں تک کہ Multi self تھیوری کے مطابق انسان کی شخصیت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ قرآن اس کا آسان حل پیش کرتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ اپنی عقل اور فکر کو استعمال کر کے اپنے Self کے لیول پر اللہ کو اپنا ماڈل بنالو اور اپنی یادداشت میں اس کو محفوظ کرلو۔ اس کے ساتھ مستقل اقدار کو سمجھ کر اپنی یاداشت میں محفوظ کرلو اس طرح ایک Integrated self وجود میں آجائے گا۔ ابھی جو بھی کام کروگے اُس میں اپنے ذہن میں جو بھی مستقل قدر کی

ضرورت ہے۔ اُس کو استعمال کرلو۔ نتیجہ وہ ملے گا جو قرآن کے اندر دیا ہوا ہے۔

(6) قرآن نے دوسروں کی مدد کا بار بار ذکر کیا ہے۔ ہر انسان کے Self کے آگے بڑھنے کے لیے ایک اہم ضرورت ہے۔ اس میں ایک بہت اہم بات ہے کہ وہ انسان کو انسانیت کے لیول پر سوچنے کا بار بار کہتا ہے۔ یہ اس لئے کہ انسان بغیر قرآن کے جغرافیائی حدود میں مقید ہوجاتا ہے۔ قرآن چونکہ انسانی ذہن کو تبدیل کرتا ہے تا کہ وہ پوری کائنات کے متعلق سوچنا شروع کردے اس لیے وہ انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ پوری انسانیت کے مسائل پر غور کرے اور ایسا وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے ہی شروع کرسکتا ہے۔

(7) قرآن کی وحی ایک Seed کی طرح ہے۔ یہ ذہن انسانی کو تدریجاً Influence کرتی ہے اور انسان اپنی فکر کے ساتھ اس کو اپنے ذہن میں درجہ بدرجہ Grow کرتا ہے۔ اس سے انسان انفرادی مسائل کے حل سے انسانیت کے مسائل کے حل کے قابل ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ ممکن اسی وقت ہے کہ انسان کا ارادہ بھی انسانیت کے مسائل کا حل ڈھونڈنا ہو۔

(8) قرآن کے مطابق (اور ہمارے فکری مشاہدہ کی رُو سے بھی) اس دنیا اور اگلی دنیا کا اللہ ایک ہی ہے۔ اس لیے Self کے لیول پر یہاں سے دوسری دنیا تک کا سفر ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔ اس لیے قرآن نے موت کو چکھنے سے تشبیہ دی ہے یعنی Self کے لیول پر انسان موت کا صرف ذائقہ چکھے گا (29:57)۔

(9) قرآن کا علم ہمیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ ہم انسانی دُنیا اور قانونِ مکافاتِ عمل کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ سے دیکھنے کے قابل ہوجائیں (انسان کی حد تک)۔ اس سے ہمیں اپنی قوتِ عمل کا اندازہ ہوجاتا ہے اور ذہنی طور پر اور عملی طور پر اندازہ ہوجاتا ہے کہ کس حد تک انسان اپنے اعمال کی دنیا میں آزاد ہے۔

(10) قرآن انسانی زندگی کے مسائل کی بہترین Explanation مہیا کرتا ہے جو کہ انسانی ذہن کی تسلی کردیتا ہے۔ یہ عقل کے معیار پر پورا اُترتا ہے اور کوئی ابہام نہیں چھوڑتا۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان کھلے دماغ سے اس کی طرف آئے اور اس کے پیش کردہ حل کو غیر متعصب (Unbiased) ہوکر غور کرلے۔ مثلاً قرآن نے ایک بہترین Economic System دیا ہے جو کہ ہر انسان کے بنائے نظام حیات کے خلاف ہے اور دونوں انسانی حصوں کی تکمیل کرتا ہے یعنی انسانی جسم اور انسانی ذات۔

(11) ظاہری طور پر ایسا لگتا ہے کہ اگر انسان قرآن کی ہدایت کی طرف آیا تو شاید اُس کی قوتِ رائے کم ہوجائے گی یعنی اُس کی Free will محدود ہوجائے گی لیکن دراصل قرآنی فکر سے انسان کی Free will کا دائرہ لامحدود ہوجاتا ہے کیونکہ یہ فکر انسان کو عقل کی سطح پر پوری دنیا کو دیکھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ ہر مرحلہ پر انسان کسی بھی مسئلہ کا حل Global لیول پر سوچتا ہے۔ پھر انسان خود کو پوری انسانی برادری کا فرد سمجھنے لگتا ہے چونکہ اس سوچ میں اگلی دنیا بھی آجاتی ہے۔ اس لئے انسان میں ''احساسِ آخرت'' پوری طرح بیدار ہوجاتا ہے۔ اس سے انسانی ذہن کی وسعتیں بڑھ جاتی ہیں اگر اس مقالہ کے سلسلہ میں کوئی سوال یا وضاحت درکار ہو تو آپ مجھے میری Email کے ذریعہ رابطہ کرسکتے ہیں۔

عمران شاہد ٹورانٹو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر بلند اقبال کے جواب میں چند گزارشات

جناب والا! گزارش یہ ہے کہ آپ کے نظریات سیکولر ہیں۔ سیکولرازم میں انسانی کریکٹر یا مستقل اقدارِ حیات کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ جو شئے کسی ایک فرد یا قوم کے مفاد میں ہو اُسے استعمال اور اختیار کر لیا جاتا ہے دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی جاتی ہے بیشک وہ شئے باقی دنیا کے لیے کتنی بھی زہرِ قاتل کیوں نہ ہو۔ حیرت ہے اس کے باوجود اس نظریہ کے حامی خود کو انسانیت کا بہت بڑا چیمپین تصور کرتے ہیں۔ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں ایک عظیم الشان انقلاب لیکر آئے اسی بنا پر مجھ جیسے بیشمار لوگ آج اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہ ایک کتاب بھی لائے جسے قرآن حکیم کہا جاتا ہے۔ یعنی حکمت والی کتاب۔ سیکولرازم کے ماننے اور چاہنے والوں کا خیال ہے کہ یہ کتاب خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ چلیے تھوڑی دیر کے لیے ہم اس بات کو فرض کر لیتے ہیں آپ احباب جو سیکولرازم کے حامی ہیں چار پانچ سو برس قبل از مسیح کے اسکالرز اور اُن کی کتابوں کو زیرِ بحث لے آئیں گے۔ اُن کے حوالے دئے جائیں گے مگر اس کتاب قرآن کریم پر بات نہیں کی جائے گی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک پرانی کتاب ہے مسلمانوں کے جذبات چونکہ اس سے وابستہ ہیں اس پر تنقید کرنے سے یہ لوگ مشتعل ہو جاتے ہیں لہٰذا ہم اس کتاب پر بات نہیں کر سکتے۔

مگر ٹھہریئے آپ اُن تمام شخصیات کو جن کے ساتھ اس اُمت کو بے انتہا عقیدت و محبت ہے اُن سب کی تو ایک منظم اور بھرپور طریقوں سے Character Assassination کی جاتی ہے اُسوقت ان کے جذبات کا لحاظ کیوں نہیں کیا جاتا؟ مغرب اور ان نظریات کے حامل لوگوں نے سب سے پہلے یہ حربہ حضور نبی اکرم صلی اللہ وعلیہ وسلم کی ذات اقدس و اعظم کے خلاف استعمال کرنے کی جسارت کی۔ بجائے اس کے کہ بنی نوع انسان کے لیے آپکی انقلاب آفریں تعلیمات احکامات ہدایات تصورات ونظریات اور آپکی سیرت و کردار جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اُس پر بات کی جاتی،

تاریخ و روایات میں جو رطب و یابس موجود تھا اُسے اٹھا کر آپ کی ذات بابرکات پر اچھالنا شروع کر دیا۔ بعینہٖ یہی حربہ برصغیر پاک و ہند میں حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمہ جنکی فکری پختگی و بلندی کی ایک دنیا معترف ہے جو سیکولرازم کی راہ میں بڑی محکم قوت ثابت ہوئے ان کے خلاف بھی استعمال کیا گیا، ان کی فکر کو زیر بحث نہیں لایا گیا، نہیں لایا جاتا بلکہ یہ کہ ان کی شادیاں کتنی تھیں اُن کے معاشقے کتنے تھے لندن میں کن حسیناؤں کی زلفوں کے وہ اسیر تھے کن کلبوں میں وہ راتیں بسر کرتے تھے وغیرہ۔ اب یہی کوشش بانئ پاکستان حضرت قائداعظم علیہ الرحمہ کے حوالے سے بھی جاری ہیں حالانکہ یہ تمام تر ''دلائل'' الزامات اور غلاظت اُس دور میں بھی اچھالی گئی جن دنوں یہ سیاسی جنگ اپنے عروج پر تھی اسکے باوجود مسلمانان ہند نے اُن تمام مذہبی سیاسی اور سیکولر قوتوں کو جو ایسی الزام تراشیاں کر رہے تھے شکست فاش سے دوچار کیا مگر شومئ قسمت کہ یہ لوگ ابھی تک اپنے زخم چاٹ رہے ہیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مُصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی!

یہ بات درست ہے کہ مملکت خداداد پاکستان جن اصولوں اور بلند مقاصد کے لیے حاصل کی گئی ہم بحیثیت قوم ابھی تک اس میں کامیاب نہ ہوسکے بلکہ آج تو اُس سے کوسوں دور ہیں جسکی اپنی وجوہات ہیں مگر

کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا، وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں

اظہارِ لاتعلقی

ادارہ طلوعِ اسلام کی ویب سائٹس اور سوشل میڈیا پیجز اور چینلز کے ایڈریس اور یو آر ایل ماہنامہ طلوعِ اسلام کے پہلے صفحہ اور بیک ٹائٹل پر شائع ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے بھی فیس بک کے پیجز اور چینلز وغیرہ جن پر پرویز علیہ الرحمہ کا نام، تصویر یا ادارہ طلوعِ اسلام یا قرآن خالص وغیرہ جیسے ملتے جلتے ناموں سے پیجز چل رہے ہیں ان کا ادارہ طلوعِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ادارہ طلوعِ اسلام کے آفیشل لنکس درجِ ذیل ہیں:

www.toluislam.org
www.facebook.com/IDARATOLUEISLAM1
www.youtube.com/@idaratolueislam
www.instagram.com/idaratolueislam
www.facebook.com/TalueIslam/
www.x.com/talueislam

جمیلہ خاتون پالوی، بھارت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر: 3)

خواتین کا صفحہ

عورت اور قرآن

اس وقت دنیا میں 79 (اُناسی) آزاد ممالک ہیں۔ اُن میں سے 40 (چالیس) آزاد ممالک میں ''عورت'' کو مردوں کے برابر ''سیاسی حقوق'' مل چکے ہیں۔ ان ممالک میں ''عورت'' کو نہ صرف ووٹ دینے کا حق حاصل ہے بلکہ وہ سرکاری عہدوں پر بحال ہونے کا بھی حق، مساوی حیثیت سے حاصل کر چکی ہیں۔ ''اقوام متحدہ'' کے منشور میں بھی ''مرد'' اور ''عورت'' کے حقوق بلا استثناء ''برابر'' تسلیم کئے گئے ہیں۔ 19 نومبر 1946ء کو ''اقوام متحدہ'' کی جنرل اسمبلی نے ممبر ممالک سے سفارش کی ہے کہ وہ ''عورت'' کو ''مرد'' کے برابر ''سیاسی حقوق'' دیں۔ اس سلسلے میں اقوام مقدہ کے ''معاشی اور سماجی کونسل'' کے ماتحت ''عورت'' کے معاملات سے متعلق ایک کمیشن بھی بنایا گیا ہے جس کے ذمہ سفارشات و تفصیلات تیار کرنے کا کام ہے۔

جمہوریۂ ہند کے آئین و دستور میں بھی ''عورت'' اور ''مرد'' کے سیاسی اور دیگر حقوق بالکل مساوی تسلیم کئے گئے اور رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ جس طرح اس ملک کے تمام لوگ بغیر امتیاز زبان و مذہب شہریت کے حقوق میں برابر ہیں، اسی طرح عورت کو ووٹ دینے سے لے کر تمام سرکاری عہدوں پر بحال ہونے کا بھی حق مل گیا ہے۔

ذیل میں، دنیا کے ان چالیس ملکوں کی، مع سنہ، تفصیل دی جاتی ہے جن میں متذکرہ سنین میں ''عورت'' کو ''مرد'' کے برابر ہر قسم کے ''سیاسی و سماجی'' حقوق مل چکے ہیں۔

(1)	نیوزی لینڈ	1893ء میں	(2)	فن لینڈ	1906ء میں
(3)	ناروے	1913ء میں	(4)	ڈنمارک	1915ء میں
(5)	روس	1918ء میں	(6)	جرمنی	1918ء میں
(7)	اسٹریلیا	1918ء میں	(8)	لیگ زیمبرگ	1918ء میں
(9)	پولینڈ	1919ء میں	(10)	آسٹریا	1919ء میں
(11)	کناڈا	1920ء میں	(12)	زیکوسلواکیہ	1920ء میں

(13)	سوئیڈن	1921ء میں	(14)	ہنگری	1925ء میں
(15)	نیوفاؤنڈلینڈ	1925ء میں	(16)	برطانیہ	1928ء میں
(17)	جنوبی افریقہ	1930ء میں	(18)	اسپین	1931ء میں
(19)	سیام	1932ء میں	(20)	کیوبا	1934ء میں
(21)	اردگوے	1934ء میں	(22)	ترکی	1935ء میں
(23)	فلپائن	1935ء میں	(24)	ڈومینیکن (ری پبلک)	1942ء میں
(25)	مینگولین (ری پبلک)	1944ء میں	(26)	اطالیہ	1945ء میں
(27)	لیبیریا	1946ء میں	(28)	ایکیوڈور	1946ء میں
(29)	البانیہ	1946ء میں	(30)	برازیل	1946ء میں
(31)	فرانس	1946ء میں	(32)	یوگوسلاویہ	1946ء میں
(33)	پاناما	1946ء میں	(34)	سیلون	1946ء میں
(35)	انیزویلا	1946ء میں	(36)	چین	1946ء میں
(37)	برما	1947ء میں	(38)	کوریا	1948ء میں
(39)	رومانیا	1948ء میں	(40)	انڈیا (بھارت)	1950ء میں

ان چالیس ملکوں میں ''عورت'' متذکرہ سنین میں، تمام تر سیاسی حقوق اور کامل آزادی حاصل کرچکی ہے مگر سوائے ترکی کے ان میں کوئی بھی اسلامی ملک نہیں ہے۔

(نوٹ: یہ اعداد و شمار 1950ء کے ابتدائی دنوں کے ہیں۔ مدیر)

ضرورت رشتہ

ایک قرآنی بھائی کے لئے فکرِ قرآنی کی حامل نیک خاتون کا رشتہ درکار ہے۔ عمر یا ذات پات کی کوئی قید نہیں، نیز قابلِ احترام بیوہ خاتون بھی رابطہ کرسکتی ہیں۔ مزید احوال و کوائف کی وضاحت رابطہ کرنے پر مہیا کئے جائیں گے۔ تمام کوائف صیغہ راز میں رکھے جائیں گے۔

واٹس ایپ نمبر یہ ہیں: 03200814855، 03465373140

انجینئر سلیم اقبال

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مرحلہ وار سلسلہ

پوسٹ نمبر:2

قرآن جب غفور کا لفظ استعمال کرتا ہے تو یہ صرف ایک جذباتی صفت نہیں ہوتی۔ یہ ایک فعال قانون کی طرف اشارہ ہے، وہ قانون جس کے تحت:

غلطی ۔سچائی کی طرف رجوع

انحراف ۔سیدھے راستے کی طرف واپسی

زوال ۔کردار کی تعمیر

کمزوری ۔اخلاقی طاقت میں بدل سکتی ہے۔غفور کے اندر غَفرَ کا مفہوم ہے: ڈھانپ دینا، ڈھال بن جانا، پھر سے قابلِ استعمال بنا دینا۔یعنی غفور وہ قانون ہے جو انسان کے ٹوٹے ہوئے حصوں کو دوبارہ جوڑنے کا راستہ کھولتا ہے۔ یہ معافی کی پالیسی نہیں۔ یہ ری سٹوریشن (Restoration) کا قانون ہے۔

قرآن میں غفور اور رحیم کا غیر معمولی حد تک ساتھ آنا (جس کے بارے میں مختلف شماریات میں 60+ مقامات ملتے ہیں) یہ بتاتا ہے کہ:

غفور = واپسی اور اصلاح کا قانون

رحیم = عمل کے مطابق نتیجہ کا قانون (Effect and Cause)

یعنی: انسان اگر رجوع کرے تو غفور حرکت میں آتا ہے۔ انسان عمل درست کرے تو رحیم کا دروازہ کھلتا ہے۔ اگر انسان بدعمل ہو کر صرف ''استغفار'' پڑھتا رہے۔

تو غفور کا قانون اسے نہیں اٹھاتا۔ کیونکہ قانون رجوع + اصلاحِ عمل کے بغیر حرکت نہیں کرتا۔ کیونکہ ری اسٹوریشن اور رحمت کے نتائج دو الگ مگر جڑے ہوئے راستے ہیں۔

آپ گاڑی تیزی میں دیوار سے ٹکرا دیں۔

Sorry

کہنے سے گاڑی نہیں ٹھیک ہوتی۔ آپ کو مرمت کرنی پڑتی ہے۔ قرآن اسی مرمت کے عمل کو توبہ + اصلاح کہتا ہے۔

پھر اللہ غفور کے قانون سے سسٹم کو ری سیٹ کر دیتا ہے۔

غفر (غ۔ف۔ر) کا بنیادی مطلب ہے:

ڈھانپنا اثر کو ختم کرنا زخم پر مرہم رکھنا جھٹکے کے نتائج کو کم کرنا

یعنی غفور= وہ قانون جو غلطی کے منفی اثرات کو مٹا دیتا ہے بشرطِ اصلاح۔

یہ اخلاقی +نفسیاتی +سماجی قانون ہے،

رسموں کا کھیل نہیں۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (النساء110)

جو غلطی کرے۔ پھر اصلاح کا فیصلہ کرے تو اللہ کو غفور پاتا ہے۔

یہ فوری معجزہ نہیں۔ یہ قانونِ نفسیات+ قانونِ معاشرت+ قانونِ اخلاق ہے۔

انسانی نفسیات بتاتی ہے کہ ماضی کی غلطیاں، گِلٹ، ٹراما اور شرمندگی انسان کے دماغ میں فریز ریسپانس پیدا کرتی ہیں جس میں انسان عمل کے قابل نہیں رہتا، فیصلہ کمزور ہو جاتا ہے، اور شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہے۔ جدید نیورو سائنس یہ واضح کرتی ہے کہ ریگولر سیلف بلیمنگ دماغ کے Prefrontal Cortex کو کمزور، اور Amygdala کو زیادہ فعال بنا دیتی ہے، جس سے مسلسل ڈر، غصہ، بے بسی اور اضطراب بڑھتا ہے۔ قرآن کا غفور دراصل اسی حیاتیاتی حقیقت کے مطابق ایک قانون ہے: جب انسان غلطی کو تسلیم کرتا ہے، رجوع کرتا ہے، اور سمت بدلتا ہے تو دماغ کے نیورل سرکٹس دوبارہ جڑنا شروع ہوتے ہیں اسے Neuroplasticity کہتے ہیں۔ یعنی غفور کا قانون انسان کو اس کے ماضی کی قید سے نکال کر ایک فعال، متوازن اور خود مختار شخصیت بناتا ہے۔ اس قانون کے بغیر نہ کوئی فرد اٹھ سکتا ہے، نہ کوئی معاشرہ۔

قرآن کا غفور رسومات کا نام نہیں؛ یہ عملی تبدیلی کا قانون ہے۔ انسان کا دماغ، اس کا اخلاق، اس کی شخصیت یہ سب صرف الفاظ سے نہیں بدلتے۔ انہیں ایک ایسے ماحول، سٹرکچر اور سسٹم کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے نئے رویے، نئی عادتیں، نئی سوچ اپنانے دے۔ نیورو سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ دماغ تب بدلتا ہے جب عمل بدلے۔ صرف نعرے بدلنے سے نہیں۔

اسی لئے قرآن محض استغفار نہیں سکھاتا وہ توبہ+ اصلاح +عمل کا راستہ کھولتا ہے۔ اور اسی لئے مذہبی سماج کا سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ انسان کو وہ ماحول دینے سے قاصر ہے جس میں وہ اس قانون کو حقیقت میں جی سکے: جہاں انسان غلطی تسلیم بھی کرے، اصلاح کا راستہ بھی پائے، اور اپنی شخصیت کو دوبارہ تعمیر بھی کر سکے۔ یہ کام مشکل ہے۔

اسی لئے لوگ الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ اور اسی لئے قرآن بار بار کہتا ہے

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا---

سوائے ان کے، جو رجوع کریں اور اصلاح کریں

کیونکہ الفاظ دل کو بہلا سکتے ہیں، مگر عمل ہی انسان کو بدل سکتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بچوں کا صفحہ

نئے پڑوسی

نثار صاحب اور سرمد صاحب ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ دونوں ایک ہی مکان کے دو حصوں میں رہتے تھے۔ اِن کا آپس میں سلوک اتنا اچھا تھا کہ لوگ انہیں دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ کتنے اچھے پڑوسی ہیں۔

سرمد صاحب کے گھر اگر زیادہ مہمان آجاتے تو نثار صاحب کی بیوی آکر کھانا پکانے میں مدد کر دیتی۔ نثار صاحب کی چھوٹی بیٹی کبھی اپنی امی یا ابو سے ناراض ہوتی تو سیدھا سرمد صاحب کے گھر آتی اور آتے ہی اپنی توتلی زبان میں کہتی:

''چاچی، چاچی! میں آپ تی بیٹی ہوں۔ میں امی تے گھل نہیں جاؤں گی۔''

یہ دو گھرانے ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ دو تین سال یوں ہی گزر گئے پھر نثار صاحب کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ سرمد صاحب، ان کی بیگم اور بچوں کو بہت افسوس ہوا۔

نثار صاحب کے مکان میں نئے کرایہ دار آ گئے۔۔۔ یہ تھے اکمل صاحب۔۔۔ ایک وہ۔۔۔ ایک ان کی بیوی اور ایک بچی۔۔۔!

سرمد صاحب اپنی بیوی کے ساتھ نئے پڑوسیوں سے ملنے گئے مگر وہ لوگ بڑے لاپروا ہو کر ملے۔ سرمد صاحب کی بیگم نے گھر آکر سرمد صاحب سے یہ بات کہی لیکن ان کا دل بہت بڑا تھا۔ بولے:

''بھئی ممکن ہے کہ وہ لوگ کسی وجہ سے پریشان ہوں۔۔۔ ویسے بھی یہ تو ہمارا فرض تھا۔۔۔ ہر آدمی کو اپنا کام کرنا چاہیے۔ دوسرا کیا کرتا ہے ہمیں اس سے کیا۔''

دن گزرتے چلے گئے۔ اکمل صاحب یا ان کی بیگم ایک بار بھی سرمد صاحب کے گھر نہ آئے۔ سرمد صاحب ہی راہ چلتے اکمل صاحب کو سلام کر لیتے مگر اکمل صاحب نے کبھی پہل نہ کی۔۔۔ بھلا ایسی باتوں کا اثر کب تک نہ ہوتا۔ سرمد صاحب اور ان کی بیوی نے بھی اپنے نئے پڑوسیوں سے بات کرنی چھوڑ دی۔

رمضان شریف کا مہینہ آیا۔ یہ مہینہ برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ ہوتا ہے۔ اس سے بڑی برکت اور کیا ہو گی کہ اللہ تعالیٰ نے اسی مہینے میں اپنی آخری کتاب ''قرآن مجید'' ہمارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارنی شروع کی تھی۔

ایک دن عصر کی نماز کے بعد سرمد صاحب قرآن مجید پڑھ رہے تھے تو دیکھا کہ یہ حکم تھا:

''اپنے والدین کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ، اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ چاہے وہ رشتہ دار ہوں یا اجنبی۔''

سرمد صاحب سوچنے لگے کہ میں اپنے پڑوسیوں کے رنگ ڈھنگ سے ایسا تنگ آیا کہ قرآن شریف کا یہ حکم بھی بھول گیا۔ اپنی بیگم کو فوراً آواز دی اور کہا:

''آج افطاری کے لیے جو کچھ پکایا ہے اور بازار سے جو پھل آئے ہیں ان میں سے کچھ اکمل صاحب کے گھر بھی بھیج دو۔''

بیگم سرمد نے دو تین تھالیوں میں سب چیزیں رکھ کر اکمل صاحب کے گھر بھیج دیں۔ وہ لوگ بھی روزہ کھولنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس بات کا ان کے دل پر اثر ہوا اور سوچنے لگے کہ اگر عبادت سے دل نہ بدلیں اور ہم زیادہ اچھے مسلمان اور انسان نہ بنیں تو ایسی عبادتوں کا کیا فائدہ۔

یہ سوچ کر وہ شرمندہ ہوئے اور دوسرے دن صبح ہی صبح اکمل صاحب نے سرمد صاحب سے کہا:

''بھائی صاحب! آج آپ اور بھابھی ہمارے گھر روزہ افطار کریں اور ہاں! اپنے بیٹے اور بیٹی کو ضرور ساتھ لانا۔''

اس دن سے ان دونوں گھرانوں کا آپس میں ملنا بڑھ گیا۔ قرآن مجید کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے نے دو گھرانوں کے تعلقات کو کیسا اچھا بنا دیا۔ اگر ہم قرآن مجید کی سب باتوں پر چلنے لگیں تو زندگی کیسی پیاری پیاری ہو جائے گی۔

راستے کی خطرناک گھاٹیاں

راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرتے ہوئے مفکرِ قرآن نے کہا: لیکن عزیزانِ من! اس سفر میں ایک گھاٹی ایسی بھی آتی ہے۔ جہاں کوئی باہر کا رہزن، ڈاکہ زنی نہیں کرتا۔ خود اپنے اندر کا چور کمین میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ گھاٹی ایسی ہے جہاں سے پاؤں پھسلے تو انسان سیدھا جہنم کے عمیق غاروں میں جا گرتا ہے اور وہ گھاٹی یہ ہے کہ آپ اس سلسلہ میں جو کچھ کریں اس میں کسی دنیاوی اجر و معاوضہ کا خیال تو ایک طرف، نمود و نمائش کا شائبہ تک بھی نہ آنے پائے، کہ یہ وہ شرک کی چنگاری ہے جو سب متاعِ عمل کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس عظیم حقیقت کو بڑے بصیرت افروز انداز سے بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ: اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ ‌ۚ (17:7) تم کوئی اچھا کام کرتے ہو تو وہ کسی دوسرے کے لئے نہیں، بلکہ خود تمہاری بھلائی کے لئے ہوتا ہے۔ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلِاَنۡفُسِكُمۡ‌ؕ (2:272)۔ جو کچھ تم بظاہر دوسروں کو دیتے ہو وہ درحقیقت خود اپنے آپ کو دیتے ہو۔ اب آپ سوچئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم ایک مکان اپنے لئے بناؤ اور اس کا احسان اہل محلہ کے سر دھرو۔ تم کھانا خود کھاؤ اور اس کے شکریہ کے متمنی اپنے دوست سے ہو۔ یہی کیفیت اس ___ کام کی ہے جسے آپ قرآنی تحریک کے لئے کرتے ہیں۔ خواہ وہ مالی خدمت ہو یا صرف محنت، یا ایثارِ وقت۔ اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ سب کچھ آپ اپنے لیے کرتے ہیں تو پھر آپ کے دل میں کسی اجر و معاوضہ کی تمنا یا صلہ و ستائش کی آرزو پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اس سے آپ کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ بیدار ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ ابلیس کا افسوں ہے جس سے وہ آپ کے اعمال کو رائیگاں بنا رہا ہے۔ انسان تو ایک طرف، قرآنی ذہنیت تو اپنے خدا سے بھی یہ کہتی ہے کہ۔

شانِ عطا کو تیری عطا کی خبر نہ ہو
یوں بھیک دے کہ دستِ گدا کو خبر نہ ہو!

(پرویزؔ، سالانہ کنونشن، 9 تا 12 نومبر 1967ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف بارہ سو روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمایئے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام
B-25 گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان
فون: 042-35714546
idarati@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ پرچہ چھپنے تک شروع ہو چکا ہوگا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (معمول کے مطابق) قرآن کی رو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورہ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں:

(1) یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾ (2:183)

''اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرسکو۔''

(2) اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ -----

''یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں''۔

(3) فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ۔

''پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے''۔

(4) وَعَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ ؕ۔

(5) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(6) شَہۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ----

روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

(7) فَمَنۡ شَہِدَ مِنۡکُمُ الشَّہۡرَ فَلۡیَصُمۡہُ ؕ وَمَنۡ کَانَ مَرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ (2:183-185)

''لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو.............. تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کر لے۔''

(8) وَکُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الۡخَیۡطُ الۡاَبۡیَضُ مِنَ الۡخَیۡطِ الۡاَسۡوَدِ مِنَ الۡفَجۡرِ ۪ ثُمَّ

أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ ۚ (2:187)

اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہوجائے پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(9) أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ

اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوگیا کہ:

1۔روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے)۔

2۔روزے میں، اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہوجائے، دن کے ختم ہونے تک کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

3۔روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کردے۔

4۔اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے۔لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ظاہر ہے کہ اس میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کردے۔ایسے لوگوں کا حکم، شق نمبر ۴ میں بیان کردیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلادیں۔

غور فرمایئے! اوپر کی چاروں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہوگئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ۔۔۔وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں۔۔۔کیا ہے۔حالانکہ اس کا عام ترجمہ۔۔۔اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔۔۔کیا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔اس لئے کہ اس ترجمہ کی رو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلادیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔حالانکہ قرآن کا منشاء یہ نہیں ہوسکتا۔بات یہ ہے کہ لفظ ''طاقت'' کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ہمارے مترجمین نے عربی کے لفظ 'طاقت' کا ترجمہ اردو کے لفظ 'طاقت' سے کردیا۔ان دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا اسے نظرانداز کرگئے۔عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔محیط المحیط جلد دوم ص:1304 میں ہے۔

''طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کرسکتا ہے۔

دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اس طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب ص 103 جلد 12 میں ہے کہ:

طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بمشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار ص 155 جلد نمبر 2 میں فرماتے ہیں۔

اطَاقَۃَ دراصل مکنت اور قدرت کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اطاق الشیئ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔ یعنی دشواری کے ساتھ اسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ یُطِیۡقُوۡنَہٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار (عُذر کی جمع) کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے...... اسی بناء پر امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ:

طَاقَۃَ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے اور وَعَلَى الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں۔ جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بناء پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف، ص:255، جلد 1)۔

تفسیر روح المعانی میں ہے۔

عربی زبان میں الوسع کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَۃَ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیۂ زیر نظر) کے معنی یہ ہوں گے اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے...... (روح المعانی، ص ۵۹، جلد ۲)۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ ''طَاقَۃَ'' کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وعلی الذین یطیقون، کا ترجمہ ۔۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ۔۔ کر دینا کس قدر غلط فہمیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ ۔۔ اور جو لوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں...... کیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کر لے۔ چنانچہ وَعَلَى الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب ''جامع احکام القرآن''، ص 268۔ص 269، جلد 2 میں ہے کہ:

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید

مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں۔ ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمے کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے اور حضرت انسؓ، ابن عباسؓ۔ قیس بن السائب اور ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمد اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عباس کی روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی امِ ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بمشقت روزے رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تیرے ذمے فدیہ ہے قضا نہیں۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

الَّذِيۡنَ يُطِيۡقُوۡنَهٗ سے یہاں مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہوجانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو...... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دور ہوجانے کی کوئی امید نہ ہو۔ روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار، ص:155، ص:157، جلد 2)

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہوجاتی ہے:

1- بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔
2- حاملہ عورتیں۔
3- دودھ پلانے والی عورتیں۔
4- اپاہج اور معذور لوگ۔
5- پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ ان کی وجہ سے روزہ بمشقت رکھ سکیں۔
6- ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (Constitutionaly) کمزور پیدا ہوئے ہوں۔
7- وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پرمشقت کاموں میں ہوتی ہے مثلاً کانوں میں کام کرنے والے کارخانوں میں کام کرنے والے وغیرہ۔
8- وہ مجرم جن سے جیل میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالاتِ موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہوسکتا ہے، اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۂ بقرہ، آیات نمبر 183 تا 188)۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی نئی قیمت

جنوری 2026ء سے ''طلوعِ اسلام'' کا زرِ شرکت درجِ ذیل ہے

اندرون ملک:

فی پرچہ: 100 روپے

سالانہ: 1200 روپے

بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک: 1500 روپے

ہماری کوشش رہتی ہے کہ طلوعِ اسلام کو خوب سے خوب تر کیا جائے جس کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا پاکستان میں چھپائی کا سامان روز بروز مہنگا ہونے کی وجہ سے ہمیں دو تین سال بعد مجبوراً زرِ شرکت میں اضافہ کرنا پڑتا ہے تاکہ آمدن اور اخراجات میں توازن پیدا کیا جاسکے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ '' طلوعِ اسلام '' اب آن لائن ہماری ویب سائٹس اور سوشل میڈیا جیسا کہ فیس بک، ٹوئٹر وغیرہ پر بھی فری دستیاب ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے قارئین بلا قیمت اِس کو انٹرنیٹ کے ذریعے پڑھتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں آپ کے تعاون کی مزید ضرورت ہے تاکہ یہ سلسلہ خوش اسلوبی سے چلتا رہے۔

اِدارہ طلوعِ اسلام کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات درجِ ذیل ہیں

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور۔ 54660، (پاکستان)

E-mail: idarati@gmail.com 042-35714546, 0318-2221851 :فون

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20X30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	ہدیہ
سورۃ الفاتحہ	(1)	240	200/-
سورۃ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-
سورۃ البقرہ (اوّل)	(2)	500	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-
سورہ آل عمران (اوّل)	(3)	472	500/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-
سورۃ الانفال	(8)	210	250/-
سورۂ توبہ	(9)	530	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-
سورۂ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-14-15)	500	500/-

سورۃ النحل	(16)	334	300/-
سورۂ نبی اسرائیل	(17)	396	400/-
سورۃ الکہف، سورۂ مریم	(18-19)	532	500/-
سورۂ طٰہٰ	(20)	416	350/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سوراالحج	(22)	380	350/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ العنکبوت	(29)	388	350/-
سورۂ روم، لقمان، السجدہ	(30-31-32)	444	400/-
سورۃ الاحزاب، سبا، فاطر	(33-34-35)	570	400/-
سورۂ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ الصٰفٰت، ص، زمر	(37-38-39)	450	400/-
سورۃ مومن حٰم سجدہ، سورہ شوریٰ	(40-41-42)	624	550/-
سورُ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45-46-47)	520	500/-
سورۂ الفتح، الحجرات، قٓ، الذاریات، الطور، النجم	(48-49--51-50-52-53)	550	500/-
سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55-56-57)	384	400/-
28واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	-64-65-66) (58-59-60-61-62-63	300	300/-
29واں پارہ (مکمل)		544	400/-
30واں پارہ (مکمل)		624	400/-
شرح جاوید نامہ		800	1200/-
فہرست موضوعات مطالب القرآن فی دروس الفرقان		800	1000/-

8-مذہب کشمکشِ حیات سے فرار سکھا تا ہے۔

دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

9-مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بےعمل بنا دیتا ہے۔

دین' اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے' حرکت وعمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

10-مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح ومناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خودفریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

دین' اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتا تا ہے۔

11- مذہب' کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھا تا ہے۔

دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب وزینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے' جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے(القرآن)۔

12-مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔

دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔

13-مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلاعلم ودلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔

دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک کی بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل وتدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔

14-مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)' سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز وناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔

دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جاسکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوعِ انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔

15-مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔

دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دینِ اسلام کی اطاعت کرتا ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.79
ISSUE
02

Monthly TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam

شهر رمضان الذی أنزل فیه القرآن
هدی للناس وبینات من الهدی والفرقان

رمضان کریم